

مردِ ابریم

بأنوقدسیه



یہ ۳۷ء کا واقعہ ہے۔

ان دنوں دھرمسالہ کی کل آبادی پانچ ہزار تھی۔ لیکن اس تھوڑے سے معمورہ کے لئے بجلی، پکی سڑکیں، سول ہسپتال، سینما گھر، لڑکے اور لڑکیوں کے لئے دسویں تک سکول بمع ایک عدد انگریز ہیڈ ماسٹر کے موجود تھا۔ ایک ایسا کلب بھی تھا جس میں فیشن ایبل افسران ٹینس، برج اور بیڈمنٹن کھیلتے تھے۔ کلب مخلوط تھا اور اس میں کچھ آزاد خیال پڑھی لکھی اور امیر خواتین بھی برابر کی ممبر تھیں..... شاید اتنا شائستہ شہر ہونے کی بنیادی وجہ اپر دھرمسالہ کی چھاؤنی تھی جس میں گورکھا اور انگریز فوجوں کا قیام تھا۔

پانچ ہزار کی آبادی کے لئے تہذیبی طور پر تو حکومت نے بہت سی عنایات کر رکھی تھیں لیکن ان پہاڑی علاقوں کی شاہیں پھر بھی اداس رہا کرتیں..... پہاڑوں میں عموماً شام پڑتے ہی شہر سنسان ہونے لگتا ہے اور پہاڑی لوگ اپنے اپنے گھروں کو لوٹنے پر پہاڑوں کو اندھیرے میں ڈوبتے دیکھنا پسند کرتے ہیں۔

ایسی ہی ایک اداس رات میں گھرتی شام کو میری والدہ، بھائی اور میں گھر لوٹ رہے تھے۔ صاف ستھری سڑک کے کنارے بانس کے جھنڈوں میں جگنو جگمگا رہے تھے۔ سڑک کے ساتھ ساتھ بجلی کے بلب روشن تھے۔ سناٹا تھا۔ ایسی خاموشی جو صرف پہاڑوں پر ممکن ہے۔ چلتے چلتے میری نظر آسمان پر گئی۔ ایک ستارہ جو روشنی میں باقی تمام ستاروں سے سوا تھا مجھے نظر آیا اور پہلی بار مجھے یوں لگا کہ میں جلاوطن ہوں اور مجھے اس ستارے میں لوٹ جانا ہے کیونکہ یہی میرا مسکن اور یہی میری منزل ہے۔ میں نے اپنی پڑھی لکھی ماں سے کہا..... ”میں اس چمکتے ستارے سے آئی ہوں اور وہیں میرا گھر ہے.....“

میری والدہ کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ ایک بچہ ہیں اور ساری عمر ایک بچہ ہی رہیں وہ اتنی بات پر بیمار پڑ سکتی ہیں کہ پہلے اور میر عمر ان خان نے تین و کشیں کیوں نہ لیں اور وہ اس بات پر تندرست بھی ہو سکتی ہیں کہ عمران نے دل توڑنے میں جو کسر نہ چھوڑی تھی اس کے باوجود پاکستان بیچ جیت گیا۔ ان میں مافی کو پس پشت چھپھینکنے کی بڑی صلاحیت ہے اس لئے ایسے سوال ان کے نزدیک بچے کے بے معنی اصرار سے زیادہ نہ تھے۔

انہوں نے معصومیت سے کہا

”ہم سب اسی ستارے میں رہتے تھے..... تمہیں اور پرویز..... یہاں آنے سے پہلے“ انہیں معلوم نہیں تھا کہ ایک بچے میں جب جلا وطنی کا احساس اچانک جاگتا ہے تو اس کے دل پر کیا بیت جاتی ہے۔ ایک بار اس سے پہلے بھی میں نے ان سے ایک اور مہمل سوال کیا تھا اور سکول سے واپسی پر پوچھا تھا۔ ”امی گزر گیا کیا ہوتا ہے؟ میری سہیلیاں کہتی ہیں تمہارا ابا گزر گیا ہے۔۔۔“

میری امی نے بڑے بھول پن سے کہا..... ”گزر گیا..... یعنی چلا گیا..... یہ دیکھو ایسے.....“ وہ ایک کمرے سے دوسرے کمرے میں چلی گئیں۔ اور ان کے نزدیک یہ مسئلہ ہمیشہ کے لئے حل ہو گیا۔

میری ماں کبھی سوال نہیں بنی ہمیشہ جواب کی صورت میں زندہ رہتی ہیں۔ وہ کبھی نہیں پوچھتیں کہ یا الہی ستائیں برس کی عمر میں بیوہ ہونے پر اتنی لمبی عمر تک کس کے سہارے زندہ رہا جاسکتا ہے؟ اوکھے لوگوں کے ساتھ اوکھی اوکھی باتوں میں الجھ کر انہیں تشنہ باتوں کے جواب نہیں چاہئیں۔ وہ جوانی سے بڑھاپے تک کاسفر اپنا دل خود بسلا کر کاٹتی رہی ہیں۔ کبھی انہوں نے اپنی اولاد سے یہ سوال نہیں کیا کہ تم لوگوں کے پاس میرے لئے کیا تھوڑا سلاقت بھی نہیں ہے؟ کیا تم میرے کسی کام، کسی مشغلے، کسی دلچسپی میں کبھی بھی شمولیت نہیں کر سکتے؟ وہ اس عمر میں بھی لطیفوں پر ہنس سکتی ہیں۔ مسکریں بیل کھیل کر، گانے گاتے ہوئے پھوٹے بچوں کو کمانیاں بنا کر ان کے لئے نظمیں لکھ کر مسرور ہو جاتی ہیں۔ ان کی عبادت ہشکر گزاری، عرض گزارانے اور بھگڑنے کے لئے ضرور ہے لیکن وہ اللہ سے سوال نہیں پوچھتیں اس کا احتساب نہیں کرتیں۔ میری حالت ان سے بہت مختلف ہے میرے اندر سوالوں کی کھپ بھکڑ اپنی بن کر اگتی رہتی ہے کچھ سوال خود بخود جوابات میں ڈھل جاتے ہیں، لیکن جو کہنی ٹیک کر کھڑکی میں بیٹھ رہیں ان کے حل کی بھی ایک صورت کبھی نہ کبھی نکل آتی ہے۔

بچپن سے میں نے ایک عادت بنالی ہے کہ جب کوئی سوال میری روح کو جھنجھوڑتا ہے تو پھر میں یہ سوال کسی سے نہیں پوچھتی۔ بس اسے اپنے اندر گرداب بنانے کے لئے چھوڑ دیتی ہوں پھر اچانک کہیں سے کسی طرح اس کا جواب مجھے آپ سے آپ مل جاتا ہے۔ سن ۷۳ء میں جو سوال میں نے اپنے آبائی گھر کے متعلق اپنی امی سے پوچھا تھا اس کا جواب مجھے قدرت اللہ شہاب سے ملا..... لیکن وہ بھی اس وقت جب انہیں گزرے تین دن ہو چکے تھے۔

شہاب صاحب کے متعلق کچھ لکھنے کی مجھ میں جرات باقی نہیں رہی کیونکہ جو لوگ بیچ سے پودا، پودے سے جھاڑ، جھاڑ سے درخت اور درخت سے جھاڑھاری چھتناری چھاؤں بن جاتے ہیں۔ ان کے متعلق درستی، سچائی اور یقین کے ساتھ کچھ کہنا بڑا ہی مشکل ہے۔ عموماً نارمل انسان کی زندگی مثل گھاس کے کنتی ہے۔ سبزہ کھلا کبھی خشک رہا، کبھی ہرا..... لیکن شکل بدلتا بدلتا کبھی لارو اور کبھی قحطی نہ ہوا..... شہاب بھائی جیسے لوگوں کو سمجھنا اس لئے بھی سہل نہیں کہ گرد و تھ ایک مسلسل پروسس ہے۔ پہلے انسان ایک کام کرتا ہے پھر اسے ترک کرتا ہے پھر دوسرا شروع کرتا ہے اسے بھی ترک کرتا ہے..... بعد ازاں ترک ترک کرتا ہے۔ جو لوگ ایسے شخص کو پہلی سیخ میں



والدہ یادداشت

بچوں کا، زندگی کافی مشکل ہو گئی تھی۔

میرا خیال تھا کہ چوڑی دار پا جامہ پہن، کانوں میں کان پھول سجا، سلیم شاہی جوتی پہن، جب میں وارد ہوں گی تو اشفاق احمد تائیاں بجانے پر مجبور ہو جائیں گے لیکن اشفاق احمد ہر انسان کے متعلق ایک خواب اپنے اندر چھپا کر رکھتے ہیں۔ وہ بادشاہ گر ہیں۔ ان کا بی جاتا ہے کہ جس قدر فنیہ فطرت نے اندر لپیٹ کر رکھا ہے کم از کم اتنا قدر ضرور نکل آئے جب میں اپنے بھانویں امراؤ جان ادا بن کر موڑے پر بیٹھی تو اشفاق احمد کا منہ کڑوا ہو جاتا وہ کہتے..... ”قدیر! یہ عورت والے چونچلے چھوڑ دو.....؟ میری ساتھی بن جاؤ..... میں گاندھی کا فین نہیں ہوں لیکن اس کی پالیسی پر چل کر تمہیں اپنی ذات کا عرفان ملے گا..... کپڑوں کا سارا نہ لو..... زور کی محتاجی نہ کرو..... لکھو..... محنت کرو..... رات دن کام کام..... اور پھر کام..... پھر تمہیں ایسی آزادی ملے گی جس کا کوئی بھی کچھ نہ بگاڑ سکے گا.....“

مجھے ”کام کام کام“ کی رٹ بری لگتی تھی لیکن مجبوری تھی وسائل اتنے کم تھے کہ میں اشفاق احمد کے مقابل ”عیش عیش عیش“ کا نعرہ نہ لگا سکتی۔ گردن جھکا کر، سلیم پہن کر کتنی چلتی کام کی پنہری پر چڑھ گئی۔ ان دنوں جب ہمارا رسالہ ”داستان گو“ لنگڑی چال چل رہا تھا اور ادیب حضرات مضمون لکھنے کا وعدہ کر کے پاس وعدہ نہ کرتے تھے، مجھے ضرورت نے ادیب بنا دیا۔ اب جتنے صفحے کم پڑتے، مجھے افسانہ، مضمون، آپ بیتی، واری جانے کیا کچھ لکھنا پڑتا۔ ان ہی دنوں میں نے شکاریات پر ”میر شکاری“ کے نام سے کئی مضمون اور ”موم کی کلیاں“ کے عنوان سے ایک ناولٹ لکھا۔ ضرورت ہی کے تحت ایک دن اشفاق احمد نے مجھے کہا ”قدیر تم شہاب صاحب پر مضمون لکھ دو.....“ اس بار شخصیت میں کچھ نہیں پہنچا میں چپ ہو گئی۔

میں شہاب صاحب کو جانتی نہ تھی ان کے متعلق جو کچھ بھی خام مواد میرے پاس تھا وہ فظ شنید تھی۔ لیکن ایک بات نے مجھے خاکہ لکھنے پر اکسایا۔ میں نے تب تک یہ تجربہ حاصل کر لیا تھا کہ جو کچھ بھی خان صاحب مجھے کرنے کو کہتے ہیں۔ وہ چاہے کتنا بھی غلط کیوں نہ ہو ہمیشہ میرے فائدے ہی میں ہوتا ہے اس لئے میر شکاری کے مضمون کے ساتھ ساتھ میں نے قدرت اللہ شہاب پر جو کچھ لکھا وہ من و عن بیان کرتی ہوں، کیونکہ اس طرح آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ آدمی کس قدر غلط اندازے لگاتا ہے کس قدر بیوقوفی سے سوچتا ہے۔ انسانی ذہن ہمیشہ بظنی طرح تیرتا ہے۔ نیچے اٹھا ہوا گمراہوں میں جو سیدیاں موتی ہوتے ہیں بظن کو ان کا علم ہی نہیں ہو پاتا۔ تیس سال کی واقفیت کے بعد آج بھی میں اصلی شہاب صاحب کو نہیں جان پائی۔ میں صرف اس روشنی کو جانتی ہوں جو ان کی وجہ سے میری زندگی میں دز آئی۔ یہ مضمون قریباً اٹھائیس سال پرانا ہے جسے میں آپ کی نظر سے گزارنا ضروری سمجھتی ہوں۔

دیکھتے ہیں۔ ان کا تجربہ کچھ اور ہوتا ہے..... جو لوگ اسے دوسرے مرحلے میں دیکھتے ہیں وہ کچھ اور رائے رکھتے ہیں۔ اور جو آخری عہد میں ساتھ ہوتے ہیں ان کا مشاہدہ بالکل کچھ اور ہوتا ہے۔ جو شخص صرف لاروا کی شکل کو جانتا ہے وہ کبھی بھی تتلی کو اسی لاروہ کے تبدیل شدہ شکل نہیں سمجھ سکتا۔

ایسے لوگ جو گردھ کے پابند ہوتے ہیں۔ اور جن کے بیچ میں چھتاری چھاؤں کا جراثیم موجود ہوتا ہے ایسے لوگوں کے متعلق متضاد آراء قائم ہو جاتی ہیں۔ ان کے نظریات کی چھان چٹنگ ہوتی رہتی ہے لیکن یہ فظ صاحب اختیار لوگوں کے اختیار کی باتیں ہیں۔ گھاس اس بات پر قادر نہیں ہوتی کہ وہ درخت بن جائے لیکن درخت اس بات کی گواہی ضرور دے گا کہ کبھی وہ گھاس کی صورت ہی دھرتی سے نمو کے لئے نکلا تھا۔

شہاب صاحب کو سمجھنے میں مجھے پورے تیس سال لگے۔ جو سمجھ مجھے آج آئی ہے اس میں شک، ابہام اور الجھن نہیں ہے پورا وثوق ہے کیونکہ یقین کامل نے میرے لئے زندگی کو بہت آسان بنا دیا ہے، اور میں اسے الفاظ، عمل، نظریات یا علم کے حوالے سے نہیں بلکہ وجدان کی راہ سے سمجھنے لگی ہوں جیسے اندر میرے کمرے میں اچانک سورج کی کرن آجائے نہ صرف نظر آنے لگے بلکہ روح میں امید پیدا ہو جائے خوشی جنم لے اور جلا وطنی کا احساس جاتا رہے۔ ایسے ہی شہاب صاحب میرے لئے روشنی کا سامان بنے۔

شہاب صاحب اور عفت سے میری پہلی ملاقات میری شادی سے پہلے ہوئی تھی، لیکن یہ ملاقات مجھ پر اثر انداز اس لئے نہ ہوئی کہ میرا خیال تھا کہ میرے ہونے والے شوہر اپنی معتبری جتانے کے لئے اس بڑے افسر کو ہتھیالائے ہیں۔ ہماری شادی کچھ ایسے حالات میں ہوئی کہ میرے شوہر اشفاق احمد گھر بند کر دیئے گئے اور ہم نے اپنی زندگی چھترے چھانڈ ننگے بچے آدرشوں سے شروع کی..... ہمارے گھر میں سامان نہ تھا صرف آدرش ہی آدرش تھے۔

اشفاق احمد نے رسالہ داستان گو شروع کر دیا۔ یہ رسالہ خوبصورت تھا۔ پر سرمائے کی کمی کے باعث ڈھب سے نہ نکلتا تھا۔ کبھی مینے کے شروع میں کبھی وسط میں کبھی دو دو ماہ غائب..... عورت کے لئے آدرشوں کی خاطر جینا اور مرنا مشکل کام ہے۔ اس کے ساتھ بچوں کا دم چھلایا لگا ہے جو اسے ہر وقت دنیاوی ضرورتوں کے ساتھ باندھے رکھتا ہے۔ کبھی دودھ، کبھی بوتل، کبھی ٹوپی، کبھی بوٹ، کبھی بچے کی فیس..... کئی چھوٹے چھوٹے اخراجات ایک ساتھ جمع ہوں تو بچہ پلتا ہے۔ ہزار مرتبہ فقیری بن کر عورت ہاتھ پھیلاتی دڑے دڑے سستی ہے تو ایک بچہ جوان ہوتا ہے۔ ان ہی بچوں کی وجہ سے عورت کمین، جھگڑالو، میکہ پرست، اور شوہر دشمن بن جاتی ہے.....

میں بھی ایک عورت تھی۔ اس وقت میری گود میں انیق خاں اور انیس خاں تھے..... چونکہ بہت چھوٹے تھے اس لئے آدرشوں کے کبل میں ان کو سرودی لگتی تھی..... سمجھ بوجھ تھی نہیں۔ بغیر آسائش رفاقت کے معنی سمجھ میں نہ آتے تھے اور پھر ہر وقت کام ہی کام تھا رفاقت کیس تھی بھی نہیں۔ کبھی گھر کا کام کبھی رسالے کا کبھی

قدرت اللہ شباب

ایک محفل میں پچھلے دنوں ایک نہایت طرہ دار خاتون سے ملاقات ہوئی۔ انہیں دیکھ کر لگتا تھا جیسے وہ حال ہی میں فرانس سے امپورٹ کی گئی ہیں۔ ان کا علم پاکستان کے متعلق ایسا ہی تھا جیسا عموماً سیاحوں کا ہوتا ہے۔ انہوں نے جدید ترین فیشن پر بات کرتے ہوئے مجھے سمجھایا کہ کس قسم کی تراش کے لباس میں عورت کے جسم کے یہ یہ عیوب چھپ جاتے ہیں اور بل بوتہ پا جاے میں چال کس طرح سحر انگیز ہو جاتی ہے۔ جب فیشن پر سیر حاصل بحث ہو چکی تو آخر میں انہوں نے سوال کیا..... آپ کے ادب میں آج کل کون سا فیشن مقبول عام ہے؟

چونکہ میری معلومات کم تھیں۔ اس کا سوال سن کر میں چکرا گئی اور جواب دیا۔ میں آپ کا مطلب سمجھ نہیں۔ وہ کہنے لگیں کچھ دیر ترقی پسند ادب والوں کا بڑا زور شور تھا۔ پھر کچھ دیر یہ غزل بڑی مقبول رہی، تیرا غم ہے در حقیقت مجھے زندگی سے پیارا..... کبھی کبھی لوگ اچانک کسی مصنف کو بہت اہمیت دینے لگتے ہیں اور پھر ایک دن پتہ چلتا ہے کہ وہ تو اب ختم ہو چکے ہیں اور فلمی دنیا سے منسلک ہو جانے کے بعد ان کی بات کرنا گویا دبی ذوق کے فقدان کی دلیلی ہے یہ بتائیے آج کل ایسا جدید ترین وضع کا ادیب کون سا ہے؟ جس کو فیشن کہا جاسکے.....

میں نے حسد بھری آہ بھری اور آہستہ سے کہا..... آج کل قدرت اللہ شباب پر مضمون لکھنے اور لکھوانے کا فیشن ہے۔

فیشن میں ایک عیب بڑا جان لیوا ہے۔ اگر محض تقلید افیشن کیا جائے تو بیشتر انسان نکو بن جاتا ہے نہ بڑی بوڑھیاں پسند کرتی ہیں اور نہ وہ مور زادیاں پسند کرتی ہیں جن کے پرچہ اگر مور بننے کی کوشش کی جاتی ہے۔ فیشن زدگی کے طور پر مضمون لکھنا تو قبول کر لیا۔ لیکن اب مشکل یہ تھی کہ میں شباب کو اس طرح جانتی ہوں کہ جیسے کسی بڑی کوٹھی کے پھانگ پر روز کسی بوڑے آدمی کے نام کی محنتی سکول سے آتے جاتے پڑھی ہو..... اس کے بچوں کو آیا کے ساتھ لان میں بلا سناں کی ٹیوب کے ساتھ نئے کپڑے بھگوتے دیکھا ہوا اس کی پورچ میں لمبی لمبی کاریں رکھی اور کھڑی ہوتی نظر سے گزری ہوں۔ اس گھر سے نکلنے والے دردی پوش ہیرے، خانساے سائیکلوں پر سے گزرتے دکھائی دیئے ہوں پورچ سے ملحق برآمدے میں کبھی کبھی خوبصورت کین کی کرسیوں پر ان دوست احباب کو بھی دیکھا ہوا اس گھر میں آتے رہتے ہوں لیکن جس نام کی محنتی باہر آویزاں ہے اس کے ہمسے سے مکمل ناواقفیت ہو.....

جس انسان کے پاس ناواقفیت کی اینڈکس موجود ہو، اس سے آپ یہ توقع نہ رکھئے کہ وہ آپ کو سیر حاصل قسم کا مضمون دے سکتا ہے زیادہ سے زیادہ یہ ہو سکتا ہے کہ جس طرح عجائب گھروں میں گائیڈ ساتھ ساتھ چلتا ہے اور کہتا جاتا ہے یہ کانگرہ سکول کی تصویر ہے اس میں سنیل زادی پکھا جمل رہی ہے۔ شیر کا شکار کھیلنے والا راجپوت ہے اور مرمر کے تخت پر براجمان سلیم چشتی رحمتہ اللہ علیہ ہیں۔ اور ان کے قدموں میں مور پتکھوں کا بادکش ہاتھ میں لئے شیخو بابا بیٹھا ہے۔ یہ گندھارا سکول آف آرٹ ہے اور یہ بت بدھ کا ہے جب وہ کپل دستو سے لشیدو ہرا کو سوئی ہوئی چھوڑ کر جا رہا تھا..... یہ موہنجو داڑو کے برتن ہیں۔ ان میں وہ لوگ گندم اور جو رکھتے تھے اور ان برتنوں میں عورتیں اپنا زیور محفوظ کر کے رکھا کرتی تھیں۔ اب گائیڈ آگے آگے چلتا ہے..... ایک عنوان کو سورنگ سے باندھتا ہے اور آپ کی تحقیر آنکھوں سے متوقع رہتا ہے کہ اس کی ہر ہر بات کو مکمل رہسرج اور شدہ علم پر محمول کریں۔ میرا علم بھی گائیڈ کی طرح سنی سنائی پر زیادہ اور تحقیق پر کم مبنی ہے.....

میں آپ کے حسن ظن سے امید باندھ کر چلی ہوں کہ جو کچھ بھی شباب صاحب پر لکھنے والی ہوں اسے کم از کم اسی دلچسپی سے سنیں جس دلچسپی سے آپ گائیڈ کی باتیں سن کر تے ہیں۔ کیونکہ شباب صاحب بھی عجائب گھر میں رکھے ہوئے کسی ایسے مجسمے کی طرح ہیں جو آپ تو کم بولتے ہیں لیکن ان کے متعلق مختلف قسم کی باتیں زیادہ مشہور ہو جاتی ہیں۔

شباب صاحب سے میرا تعارف ہمیشہ دوسروں کی وساطت سے ہوا۔ یوں سمجھئے جیسے علاؤ الدین کا تعارف پد منی سے آئینے کی سطح نے کروایا اسی طرح میرے اور شباب صاحب کے درمیان کئی شفاف، کئی کھر دے، کئی اندھے، کئی دودھیا، کئی ٹوٹے ہوئے، کئی نیم ابلے نیم ملے، کئی نکون چو کو رمدور اور کئی متحد شیشے حامل ہیں۔

سب سے پہلے میں نے انہیں ایسی تین بہنوں کی آنکھوں سے دیکھا جو اپنی اپنی جگہ شباب کو اپنا بر تصور کرتی تھیں۔ بڑی نے جو ناک میں بولتی تھی مجھے کہا..... ”شباب دراصل مجھ میں انٹرپرائیڈ ہیں۔ وہ جب بھی بات کرتے ہیں۔ میری طرف ضرور دیکھتے ہیں۔ ڈیڈی سے باتیں کرتے کرتے وہ ادھر ادھر کچھ تلاش کرنے لگتے ہیں۔ اور میں جانتی ہوں کہ ان کی نظریں کس کو تلاش کرتی ہیں.....“

دوسری جو فسانہ آزادی کی سپر آرکی طرح بڑی عاشق طبع تھی اس نے مجھے بتایا..... ”شباب جانتے ہیں کہ مجھے اندھیرے کمروں سے بڑا ڈر آتا ہے انہیں مجھے ڈر کر بہت مزہ آتا ہے وہ جب بھی آتے ہیں رات گئے تک بیٹھے آسیب زدہ مکانوں کی باتیں کرتے رہتے ہیں۔ میں جانتی ہوں کہ وہ ایسی باتیں محض مجھے خوفزدہ کرنے کے لئے کرتے ہیں۔ حالانکہ وہ نہیں جانتے ہیں کہ ان کے منہ سے یہ باتیں سن

کر مجھے ذرا بھی ڈر نہیں لگتا۔

چھوٹی از روئے انصاف تینوں میں سے بھلی اور بھگت قسم کی لڑکی تھی۔ چوکور ماتھے پر سیدھی مانگ اور سیدھی مانگ کے پیچھے کھجوری چوٹی کرنے والی نے ایک روز مجھے بتایا تھا..... ”آپا اور باجی تو نہایت خود پسند واقع ہوئی ہیں۔ انہیں کیا معلوم کہ ایک ادیب کیسا ہوتا ہے؟ شباب جب بھی آتے ہیں وہ دونوں آلتی پالتی مار کر ان کے گرد بیٹھ جاتی ہیں۔ کسی کو پروا نہیں ہوتی کافی کب آئے گی..... سکوائش کون بنائے گا۔ کھانے کی میز پر پھول کون سجائے گا؟..... شباب منہ سے چاہے کچھ کہیں نہ کہیں مجھ ساری باتوں کا نوٹس لیتے ہیں۔ ادیب جو ہوئے.....“

غالباً شباب صاحب مجموعی طور پر تینوں کا نوٹس لیتے تھے۔ اور علیحدہ علیحدہ انہیں کسی میں بھی دلچسپی نہیں تھی جس طرح دھنک کا کوئی خاص رنگ کسی کے لئے جاذب نہیں ہوتا سی طرح اس سہ رنگی قوس قزح کی ایک ملی جلی دکشی تو تھی لیکن پیلے نیلے اور لال میں تفریق مشکل تھی اسی لئے شباب صاحب ان لڑکیوں کے بارے میں کسی مثبت نتیجے پر نہ پہنچ سکے۔

ویسے مثبت نتائج پر پہنچنے والوں میں سے شباب صاحب نہیں ہیں۔ ان کی آنکھوں پر ایک جانب محذب اور دوسری جانب معجوف شیشہ چڑھا ہے۔ اسی لئے اس دور رخ شیشے نے ان کی آنکھ میں ٹیلی سکوپ کی سی خاصیت پیدا کر دی ہے اور وہ گالیلو گالیلی کی طرح ستاروں پر ایمان لے آئے ہیں۔ نتائج اخذ کرنے سے پہلے چند ٹائٹل فضا میں نکلتے ہیں اور پھر کہتے ہیں۔ ”دیکھئے..... کیا ہو..... ہو سکتا ہے کہ شاید حالات یہ ضرور ہیں۔ بہت ممکن ہے کہ..... میں نے ابھی کچھ اس بارے میں سوچا نہیں..... فی الحال کچھ سوچنا یا با ضروری بھی نہیں۔“

شباب کے متعلق ان کے دوست، ان کی بیوی، ان کا بچہ، ان کے ملازم، ان کے ماتحت، ان کے رشتہ دار سبھی کوئی حتمی رائے اس لئے نہیں رکھتے کیونکہ شباب دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی کبھی نہیں کرتے۔ ان دونوں کو کہیں لسی اور دہی کر کے چھوڑ دیتے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ ان کے متعلق اتنی کہانیاں، اتنے نظریے اور ایسی ایسی قیاس آرائیوں کا دفتر کھلا رہتا ہے۔

ان کے متعلق کچھ ایسی باتیں مشہور ہیں جو نہ تو مکمل طور پر سچ ہیں اور نہ ہی جن کے بطلان کے لئے کوئی سکہ بند ثبوت ہی ملتا ہے۔ ان افواہوں میں سے کچھ ایسی ہیں جنہوں نے شباب کو لوں میں فرینک جیرس، اور چرچرڈ برٹن کا ایک ملا جلا ہولنا بنا رکھا ہے۔ ایک افواہ ایسی سرگرم ہے جس کی رو سے شباب شانی لاک ہیں ان کا ناظر ہزن انگریز سے ملتا ہے جس کے دبے بے پر تنگی ولندیزی اور انگریز قزاق بھی پناہ مانگتے تھے اس اعتبار سے وہ اصل کمرانی ہیں اور بجرے ڈونگے اور موٹو ٹوٹ سے ان کو ازلی مناسبت ہے کچھ لوگوں کی زبانی یہ بھی سنا کہ شباب دراصل شباب نہیں ہیں۔ یہ تو سبز پوش سفید ریش

والے ایک ایسے بزرگ ہیں جو بارون الرشید کی طرح بھیس بدل کر ایک ایسی ولایت کا کام چلا رہے ہیں جس کا اس دنیا کے منصوبوں سے کوئی تعلق نہیں۔ کچھ لوگوں نے انہیں ڈی میکسیٹو کا روپ دے رکھا ہے جو افروہ سے ہانگ کانگ، ہانگ کانگ سے سنگاپور وہاں سے لاؤس اور لاؤس سے بدھاپت تک ایک ایسے خفیہ مشن پر رہتا ہے جس کا علم کسی کو نہیں..... چند سیانے لوگوں نے یہ بھی افواہ چلائی ہے کہ شباب دراصل مٹی کا مادہ ہے وہ اتنا زہین، اتنا جاذب، اتنا پھر تپا، اتنا کچھ بھی نہیں صرف اسے افواہوں کا شوق ہے اور ہر افواہ دراصل اس کی خود ساختہ ہوتی ہے..... کسی سیانی ایکٹرس کی طرح۔ کون سی افواہ سچ ہے اور کس حد تک سچ ہے یہ تو مجھے معلوم نہیں لیکن اس بات کا احساس ضرور ہے کہ کسی افواہ کی نفی کرتے ہوئے میں نے شباب صاحب کو کبھی نہیں دیکھا۔ اور اس کی وجہ غالباً وہ نہیں جو آپ سمجھتے ہیں وجہ صرف اتنی ہے کہ ان کے نزدیک تردید کرنا غالباً ایک مثبت نتیجے پر پہنچنے کے مترادف ہے اور نتائج اخذ کرنے سے انہیں کوئی دلچسپی نہیں.....

باضابطہ طور پر پہلی بار شباب سے میری ملاقات اشفاق نے کروائی۔ اشفاق کے یہ پہلے دوست تھے جنہوں نے مجھ پر ایک بے دھیانی نظر بھی نہیں ڈالی۔ انہیں نہ میرے نفسیاتی تجزیوں کی ضرورت تھی، نہ میری دل جوئی کی، نہ ہی میری مالی مدد کی..... یوں جب پہلی بار میری شخصیت کی نفی ہوئی اور میری خدمات کو فروغی سمجھا گیا تو میری بہت شیم ہوئی اور میری انا نے یہ بدلہ لیا کہ چوری چوری شباب کے خلاف دل میں دیوار چین تعمیر کروادی اور جگہ بہ جگہ ایسے کیونوں کا پہرہ بٹھا دیا جس کے ذمہ صرف ایک ہی کام تھا کہ شباب کے متعلق دیوار چین میں کہیں شکاف نہ آئے پائے۔ بھلا ہواس سسٹم کا کہ تاحال دیوار چین قائم ہے۔

اشفاق اور شباب کی دوستی افریقہ کا وہ پھول ہے جو کلے من جامو کے پہاڑ پر اگتا ہے اور جوئی کوئی ذی روح پاس آجائے معمولی پتے کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ شباب اور اشفاق لوگوں کے سامنے اجنبی ہیں۔ شاید تجلیے میں بھی اجنبی ہوں لیکن لگتا ہے کہ احباب کا پتہ کاٹ کر جب وہ تماہوتے ہیں تو وہ اپنے اپنے سیف کی چابیاں لگا کر وہ مال متاع ضرور ایک دوسرے کو دکھاتے ہیں جنہیں انہوں نے عام نظروں سے بچا رکھا ہے۔

پتہ کاٹنے سے مجھے یاد آیا کہ شروع شادی کے دن تھے جب پہلی بار شباب صاحب آید شام سمن آباد میں ہمارے ہاں آئے۔ ان دنوں ہم ایک ایسے مکان میں رہتے تھے جس کا باہر والا ٹلکا سارا دن کھلا رہتا تھا۔ اور اندر کے ٹلکوں سے مستقل سول سول کی آواز آتی تھی۔ ٹلکے کی وجہ سے باہر کے دس فٹسے باغ میں کچھ تھا۔ شباب جب برآمدے تک پہنچے تو ان کے بوٹ لٹھرے ہوئے تھے۔ کمزور بجلی کی روشنی میں بوٹوں پر سے گارا جھاڑتے ہوئے انہوں نے اشفاق سے کہا..... ”میرے ساتھ چلو

تھوڑی دیر حبیب کے پاس بیٹھے ہیں اور پھر..... میں اسے ساتھ لے جاؤں گی.....؟ ”میں نے گہرا کر ہاں کہہ دی۔

ان دنوں میرا سکھ ورنی تھا۔ اور ابھی محکمہ ازدواج میں اس کی ڈی ویلیویشن نہیں ہوئی تھی۔ میں چاہتی تو شباب کے ساتھ اشفاق کو نہ دیتی لیکن جب کرنسی طاقتور ہو تب کسی حکومت کو فکر نہیں ہوتا۔ سارے فکر تو اس وقت پڑتے ہیں جب اپنے روپیچے کی قیمت بیرون مارکیٹ میں چار آنے رہ جاتی ہے۔

اس دن کے بعد شباب جب بھی آتے اشفاق کو اغوا کر کے لے جاتے بالفاظ دیگر میرا پیٹہ کاٹ دیا جاتا۔ میں زخم خوردہ دل میں سوچتی رہتی کہ وہ دن کب آئے گا جب شباب مجھ سے کہیں گے ”اشفاق کے لئے تو ہم مر گئے کبھی ملتا ہی نہیں۔ وہ بھی کیا دن تھے جب سارا سارا دن لارنس میں بیٹھے مالے کھایا کرتے تھے اسے تو اب ہمارے لئے وقت ہی نہیں ملتا۔“

یہ لمحہ گویا میرے لئے فتح عین کالمحہ ہوتا۔ میں ان کافنیاتی تجزیہ کرتے ہوئے کہتی..... ”شباب بھائی آپ اشفاق کی محفلوں کو خرس نہیں رہے ہیں۔ آپ دراصل ایک خاص قسم کے پیکلس میں مبتلا ہیں۔ آپ اونچی عمارتوں سے خوفزدہ ہیں..... آپ عید کے لئے عید کارڈ خریدنے سے گھبراتے ہیں۔ فلم کا پہلا شاور سینچر کا آخری دن آپ کے لئے منسلک ثابت ہو سکتا ہے..... آپ ذہنی طور پر یوٹیگو کے مریض ہیں۔“

لیکن اتنے سال گزر جانے کے باوجود وہ لمحہ نہیں آیا میں اپنی جگہ فکر مند ہوں کہ کہیں میری یہ تمنا ناکرہ حسرتوں کی فہرست میں ہی شامل نہ ہو جائے اور مجھے ان کافنیاتی تجزیے کرنے کا موقع نہ ملے۔ دراصل شباب گل دوپہریا کا پھول ہیں اور میں اسے پھری وہ لٹری ہوں جب کوئی دوپہریا کا پھول کھلا نہیں رہ سکتا۔ شباب وہ بچہ ہیں جس نے استانی کے چاک چرا کر بستے میں رکھے ہیں اور میں وہ مانیٹر ہوں جو استانی سے بھی زیادہ سنگ دل ہے۔ میری اور ان کی شخصیت کی رقیں اس طرح نہیں لکھی جاسکتیں کہ ان کے درمیان الجبرے کے برابر کی علامت آسکے۔ ہم جب بھی اکٹھے ہوتے ہیں جیمز بونڈ سیریز کے ایکشن کی طرح ان کا چہرہ واٹر پروف رہتا ہے وہ تبت کے لامائوں کی طرح علیحدگی اختیار کئے رہتے ہیں اور ان سے ایسی برقی ہوائیں آتی رہتی ہیں جیسے پانچ ٹن کے ایئر کنڈیشنر سے غریبہ ہواؤں کا نزول ہو رہا ہو۔ اشفاق کی دسلاط سے جس شباب سے ملاقاتیں ہوئیں ہوتی رہیں اور ہوتی رہیں گی وہ شباب گویا کسی اجنبی آدمی کا وہ کارڈ ہے جو وہ آپ کو یورپ کے سفر کے دوران دیتا ہے اس سے آپ کو شہر کی کسی خوبصورت بلڈنگ یا منظر کا ویڈیو چل جاتا ہے لیکن دیں والوں کی خبر نہیں ملتی.....

میرا خیال تھا کہ عفت کچھ دیں والوں کی خبر رکھتی ہوگی اس لئے جب میں پہلی مرتبہ اپنے بچوں

کے ساتھ شباب کے گھر پہنچی تو بڑی پر امید تھی۔ میرا خیال تھا کھانے کی میز پر انسان کی شخصیت کی تہیں خود بخود کھل جاتی ہیں۔ بعد ازاں معلوم ہوا کہ جو پرت شباب پر ہیں وہ دروپدی کی ساڑھی کی طرح لاشٹائی ہیں۔

تب شباب اور عفت کراچی میں رہتے تھے اور ان کی دو منزلہ کوٹھی ہاتھ آئی لینڈ میں سمندر کی دلدل کے رخ پر تھی۔ پچھلے کس ریل کی پٹری بھی تھی۔ جو غالباً پچھلے نہیں بلکہ میرے ذہن میں کہیں بچھی تھی اور رات گئے اس پٹری پر ریل گاڑی چھکا چھک آیا کرتی تھی۔ ہاتھ آئی لینڈ کے سارے قیام کے دوران مجھے صرف یہ علم ہوا کہ شباب کو کچھ پیسہ ہے اور وہ ریڈیو بڑے شوق سے سنتے ہیں۔ اس کے علاوہ اور کچھ معلوم ہو سکا تو وہ صرف اس قدر تھا کہ شباب کہیں جا رہے ہیں اور ان کا سامان بیک کرانے کے لئے کچھ پیکروں سے بات چیت ہو رہی ہے یہ پیکر کبھی کھوکھوں کی فرمائش کرتے تھے کبھی ٹاٹ اور پھونس کی پر یہ پتہ نہ چلتا تھا کہ کیا کچھ بیک ہو چکا ہے اور کیا کچھ بیک ہو گا؟

اچھی بات ملے ہے کہ ہماری آمد پر شباب صاحب نے نہایت احتیاط سے اندر والے خانوں میں اصلی شباب کو روٹی کا گھوسٹلا بنا کر پیک کر دیا تھا۔ اسے اگرچہ گا کھلایا جاتا تو ہماری غیر موجودگی میں ہمارے سامنے تو ایک تھرموس نما شباب کھانے کی میز پر موجود ہوتے جن کے متعلق یہ فیصلہ نہ ہو سکتا کہ ان کے اندر برف کوٹ کر رکھی گئی ہے کہ ابھی کافی..... کافی کا ذکر کرو تو مفتی جی کا نام لئے بغیر بن نہیں آتی.....

اس کافی کے رسیا جگت گورونے ہماری زندگی کافی زچ کر رکھی ہے جن دنوں ہم ہاتھ آئی لینڈ میں اپنے دونوں بچوں سمیت اپنا پہلا ہینی مون منانے گئے تھے۔ ان دنوں شو منی قسمت سے ممتاز مفتی بندر روڈ پر ایک ایسے چوہارے پر مقیم تھے جس کے سامنے رات کے وقت کسی فلم کا اشتہار نیون بیوں میں جگمگا رہا تھا۔ شہ نشینوں پر سے ٹریم چھوٹی سی بس نظر آتی تھی اور ہمسائے میں ایک ایسا سینما گھر تھا جس کے ریکارڈ اور پورے ڈائلاگ گھر بیٹھے سنائی دیتے تھے۔

ہاتھ آئی لینڈ میں اتنے چوتھی شام تھی کہ اشفاق نے مجھے حکم دیا کہ مفتی صاحب کے گھر چلنا ہے کیونکہ وہ پھر سے بالکل ہاؤرن اور اندر سے نہایت دقناوس قسم کے کنفوچسٹ آدمی ہیں۔ یہ مفتی صاحب کے گھر میں شادی کے بعد میری پہلی رونمائی تھی۔ میں اور اشفاق جب کئی قسم کے پھانک دروازے، زینے اور تختے گزر کر مفتی صاحب کے چوہارے پر پہنچے تو مفتی صاحب ایک لدے پھندے کمرے میں تخت پوش پر ابھیٹا ہئی غاروں میں پھنسی ہوئی پسرانوں کی طرح بیٹھے تھے۔ منہ میں حقے کی نے تھی ہاتھ میں شطرنج کا مرہ تھا شہ نشین میں بھابی اقبال کھڑی بسکٹ کھاری تھیں اور تیل کے سنوو پر کراچی جیسی جگہ میں تھا پیاں سلگ رہی تھیں۔

”کون ہے؟.....“ مفتی صاحب نے اپنے بھانجے قیصر سے سوال کیا۔ جو بھانجا بھتیجا کم اور تھانے دار زیادہ تھا۔

”ہم ہیں“ اشفاق نے اپنے مخصوص لہجے میں کہا۔

”ہم کون.....“

”اشفاق..... قدیر.....“

اب مفتی صاحب کارنگ آؤے میں سے نکلی ہوئی سرخ اینٹ جیسا ہو گیا۔

”میں نے سنا ہے تجھے کراچی آئے چار دن ہو گئے ہیں.....“

”یہ قدیر بھی ساتھ ہے.....“ مجھے ڈھال کی طرح آگے بڑھاتے ہوئے اشفاق بولے۔

”کہاں ٹھہرا ہے تو.....؟.....“

”باتھ آئی لینڈ میں.....“

”باتھ آئی لینڈ میں..... پر کہاں؟.....“

اب اشفاق کبھی ایک پاؤں پر بوجھ تولے کبھی دوسرے پر۔ ان کی آواز میں بھی ایک خاصیت نہ رہی

تھی جس کی وجہ سے میں انہیں خان صاحب بلانے لگی تھی۔

”وہ جی باتھ آئی لینڈ میں..... قدیر اور بچے بھی ساتھ ہیں۔ انہوں نے مدعو کیا تھا مفتی

صاحب۔“

”کس نے مدعو کیا تھا تجھے؟۔ میرے سوائے؟..... ایسا اور کون ہے سارے کراچی میں؟.....“

مفتی جی نے اپنی نیکی ناک کی سیدھ پوچھا۔

”وہ اپنے شہاب صاحب ہیں ناں..... تو نہیں جانتا شہاب کو..... شہاب رائٹر۔“

”مجھے کوئی ضرورت نہیں ہے انہوں کو جاننے کی.....“

قریب والے سینا گھر سے ملکہ پکھراج نے بڑی تنبیہ بھری آواز میں گایا.....

”رب خیر کرے..... کیوں دل دھڑکے۔“ اس کے بعد بڑی مغلط گفتگو ہوئی۔ ایک ایسے مفتی

جی میں جو افسروں کے خلاف تھا، ان کے چچوں کے خلاف تھا اور ایک ایسے شوہر میں جو اپنی بیگم کو پہلی بار

من چاہے دوست کے گھڑ لایا تھا۔ زیادہ گفتگو مفتی جی نے کی اشفاق نے کئی بار فل سناپ کے طور پر

کہا..... ”شہاب وہ نہیں جو آپ سمجھتے ہیں آپ اسے مل کر تو دیکھئے.....“

”میں افسروں سے کبھی نہیں ملتا..... ان کی ملاقاتیں تمہیں ہی مبارک ہوں.....“

”تو جب آپ اس سے ملے نہیں تو پھر رائے کیوں دے رہے ہیں.....“

”اس لئے کہ ایسے بہت سے افسروں کو میں جانتا ہوں۔ مگر مجھ کی جلد ہاتھی کا دماغ اور گیدڑ کا

ضمیر.....“



اس رائے کے بعد میں نے کبھی ممتاز مفتی کے سامنے قدرت اللہ شہاب کا ذکر نہ کیا کیونکہ میں صلح کل قسم کی عورت ہوں اور مجھے سرگ بچانے کا کچھ ایسا شوق نہیں ہے۔ ممتاز مفتی بڑے خوبصورت خط لکھتے ہیں بلکہ یوں سمجھئے کہ خطوں میں بہت خوبصورت تاریخچے ہیں۔ ہاتھ آئی لینڈ کے واقع سے چند سال بعد اتفاقاً مفتی جی کا ایک طویل خط پنڈی سے ملا۔ بڑی خوبصورت انگریزی میں لکھا تھا..... میں اس کا ترجمہ پیش کرتی ہوں۔

صرف شفق ہا اور قدسیہ جات کے لئے

لگتا ہے کہ وقت آگیا ہے۔ میں ایک اندھا آدمی ہوں۔ میں دیکھ نہیں سکتا، سمجھ نہیں پاتا لیکن اندھے میں عموماً جذبات کی گہرائی پیدا ہو جاتی ہے میں محسوس کرتا ہوں کہ فضا میں کچھ ہے میرے ارد گرد فضا میں مقناطیس کشش ہے۔ یہ مقناطیس دائرہ تمہارے دوست ستارہ کی وجہ سے ہے۔ یہ نام اسے ان لوگوں نے دیا ہے جو وثوق سے جانتے ہیں۔ یہ نام بہت اہمیت کا حامل ہے۔

(۱)..... چاند بڑھتا گھٹتا ہے لیکن ستارہ ہمیشہ جامد رہتا ہے۔

(۲)..... ستارہ ہمیشہ چاند کے ہمراہ رہ کر اسے راہ سمجھاتا ہے۔ ظاہر ہے جو نبی ہلال ذرا بھی بے راہ ہو ستارہ اس سے علیحدہ ہو جاتا ہے۔

لگتا ہے کہ ستارہ کے لئے بالآخر یہی منزل ہے کہ وہ ہلال کو مشورہ دینے کے بجائے خود فعال ہو جائے۔ یہ آخری منہام کچھ فخر مندی کا نہیں بلکہ ذمہ داری اور خدمت کا ہے آخری مقام پر پہنچنے کے لئے ”س“ کو اپنا حالیہ عہدہ چھوڑنا پڑے گا۔ پھر وہ آخری مقام پر آ سکے گا۔ اس وقت اس کے ارد گرد شفقہا، قدسیہ جات، علی خاں مفتی ہا ہوں گے..... وہ اپنی ساری خوشیاں بانٹتا ہے لیکن اپنے غم سب سے پوشیدہ رکھتا..... وقت کم ہے.....

اس خط کے چند دن بعد پھر مفتی جی کا خط ملا۔

شفق

ستارہ ۹ کو یہاں سے کراچی گیا۔ ۳ دن کراچی۔ ۴ دن ڈھاکہ، ایک دن لاہور، اٹھارہ کو واپسی۔ ستارہ سے تمہارا اہمنا ضروری ہے خصوصی بات ہے سستی نہ کرنا.....

ممتاز

چونکہ اس تاریخ خط میں یہ وضاحت نہ کی گئی تھی کہ ستارہ کس ذات گرامی کا نام ہے اس لئے ساری رات یہ تصفیہ کرتے گزری کہ اس نام کا اطلاق کس ذات شریف پر کریں۔ سبٹ کی بکری نما مرزا سے لے کر موتی بازار کے راجا صاحب تک سب کے نام کے ساتھ یہ لقب لگا کر دیکھا لیکن یہ دمدار ستارہ کسی کی شخصیت کے ساتھ فٹ نہ بیٹھا تو ہم مارے تجسس کے بھگم بھاگ ایئر پورٹ پر پہنچے۔

طیارہ پون گھنٹہ لیٹ تھا۔ لیکن ہم ستارہ کو دیکھنے کے اس قدر متمنی تھے کہ وہیں جے رہے۔

جہاز سے جب میٹر حیاں لگیں اور بیٹھو بھاٹک کھلا ایئر ہو سٹس کی صورت نظر آنے لگی تو ہم بچوں کی طرح جھنگے پر چڑھ گئے اور ہر آنے والے کو بنظر غائر دیکھنے لگے۔ سب سواریاں ایئر ہو سٹس کو سلام کرتی اتر آئیں لیکن ستارہ طلوع نہ ہوا۔

حسن اتفاق سے ان ہی سواریوں میں ایک شہاب بھی تھے جو نہایت ڈھیلے ڈھالے انداز میں بریف کیس جھلاتے باقی سواریوں سے نظریں بچاتے چلے آ رہے تھے۔

ابھی وہ اپنے سامان کی پرچیاں سی ٹول رہے تھے کہ ہم باہر نکلنے والے گیٹ پر جا پہنچے۔

”یار تیرے ساتھ کوئی ستارہ نامی آدمی تو نہیں آیا پنڈی سے.....“

”ستارہ امتیاز کہ ستارہ قائد اعظم.....؟“ شہاب بھائی نے سوال کیا۔

اشفاق نے میری طرف دیکھا۔ مفتی صاحب یہ وضاحت کرنا بھول گئے تھے۔

”غالباً ایسی تو کوئی بات نہیں لکھی مفتی نے۔ مفتی کا کوئی دوست تھا جہاز پر؟.....“

اشفاق نے پھر پوچھا ”میں مفتی کو ہی بہت کم جانتا ہوں اس کے دوستوں کو کیسے پہچان سکتا ہوں؟.....“ شہاب بولے۔

اشفاق کی تشویش دیکھ کر شہاب بھائی بڑی محبت سے بولے..... ”کام کیا ہے؟.....“ ”کام تو

نہیں ہے صرف مفتی صاحب کا حکم ہے اور ان کا فرمان نادر شاہی ہوا کرتا ہے۔“ اب شہاب کے لئے

نادر موقعہ آیا۔ وہ دوسروں کے احکامات کی اہمیت کو گھٹا کر بہت خوش ہوتے ہیں۔

جھٹ بولے..... ”میں کراچی کا سفر گول کرتا ہوں۔ تم مفتی صاحب کے ستارے کو گول

کرو۔ اور قدسیہ کو غالباً بچوں کی یاد ستاری ہوگی اسے گھر بھیج دیتے ہیں۔ تم میرے ساتھ چلو.....“

”لیکن جی ہمیں تو یہاں سے اماں جی کے گھر جانا ہے مڑنگ روڈ.....“ میں نے اپنی زبردستی دیکھ کر

کہا.....

دونوں نے پہلے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور پھر اشفاق کے چہرے پر مظلومیت چھا گئی۔

”ہاں یار..... اماں جی کے جانا تھا مجھے تو..... وہاں بخشن خاں سے بوریاں آئی ہوئی ہیں گندم کی، اگر دو

چار دن ہم نہ گئے تو ساری گندم اماں جی بانٹ دیں گی ادھر ادھر.....“ گندم تو بڑھے پر جائے گی.....

قدسیہ کو مزنگ چھوڑ جاتے ہیں وہاں سے داتا صاحب چلیں گے۔“

داتا صاحب کے نام پر میں مزاحمت نہ کر سکی۔

چند دن بعد پنڈی سے ایک اور تار خط کی صورت میں آیا۔
ہمارا بی!

کل میں نے خواب دیکھا تھا۔

ستارہ خواب میں تھا۔

اس کے ہاتھ میں گڑھل کا پھول بھی تھا۔

ساری باتیں سچی ہیں۔

بھائی جان بھی یہی کہتے ہیں۔

مفتی

پہلے تو معمرہ حل ہونے کی کوئی صورت تھی لیکن اب تو کافکا کی کہانی میں ایڈ گراہین پو بھی شامل ہو گیا۔ ستارہ کی گواہی بھائی جان نامی کوئی غیر معروف ہستی دینے لگی اور ساری باتیں گڑھل کے پھول سمیت خواب کی تھیں اس لئے ہم جو خواب سے باہر تھے ہکا بکارہ گئے۔ میں نے اور اشفاق نے غصے میں فوراً خط لکھا کہ یہ ستارہ کھانے میں ہے، پینے میں استعمال کی چیز ہے کہ سجاوٹ کی؟ اکیس سوالوں کے اندر بوجھی جاسکتی ہے کہ اس کے لئے کوئی راستے والی جیٹاں ایجاد ہوئی ہے؟ اس مدلل انکوائری پر یہ خط موصول ہوا۔

ہمارا بی!

شغلم کا چارمٹ بھجوانا میں خود آ رہا ہوں۔

رنگ..... رنگ رنگ

ستارہ کل شام ملا تھا۔ رات گئے تک اشفاق کی باتیں ہوتی رہیں۔

مفتی

اس خط سے ستارہ نامی اندر گر آؤند آدمی کا پتہ نہ چلا۔ یہ بات سمجھ میں آگئی کہ مفتی کے اکلوتے بیٹے عکسی پران دنوں پینٹنگ کا بھوت سوار ہے اور طلبہ بچانے کی بیچ نکل گئی ہے۔

یہ معمرہ تو ایک عرصہ نہ کھلا لیکن ایک دن اچانک مرزا صاحب آ گئے۔ مرزا صاحب جو سلٹ کی

بکری کی طرح بے ضرر چھوٹے سے پیارے سے ہیں اور جنہیں ہم عام طور پر مرزا آف کویت کے نام سے یاد کرتے ہیں، بسنی ناکیز کے کامیڈین وی۔ ایچ۔ ڈیسانی کے ہم شکل ہیں اور بیک وقت حاضرو غائب رہنے کا فن جانتے ہیں۔ ان کی زبانی اشفاق کے دوستوں پر تبصرہ سن کر عجب لطف ملتا ہے کیونکہ وہ بیک وقت حسد اور فراخ دلی کا شکار رہتے ہیں۔

”کل شام مفتی ملا تھا۔ مفتی ازاے حرامزادہ..... کیوں بیٹا قدسیہ.....؟“

”ابھی میں تصدیق نہیں کر سکی اس بات کی مرزا صاحب.....“

چھوٹی سی انگشت شہادت اٹھا کر مرزا صاحب آف کویت ہنستے ہیں اور پھر چھوٹی چھوٹی آنکھیں اشفاق کی طرف موڑ کر کہتے ہیں، ”یاریہ تیری بیوی کھری ہے کھری.....“

”اچھا مرزا جی وہ پنڈی کا کیا حال ہے، عمر کیسا ہے؟ را جا صاحب کا کیا حال ہے؟“

”سب ٹھیک ہیں حرامزادے..... یا روہ قدرت اللہ شباب کیا چیز ہے؟.....“

”چیز؟ آدمی ہے وہ تو.....؟“ اشفاق نے کہا

”آدمی.....؟ اس کو آدمی کہتے ہو؟..... بلڈی راسکل.....“

”زبان سنبلال کر بات کر مرزا..... بلڈی راسکل ہو گا تو.....“

”تیرے لئے تو وہ ایک بہت مفید اور اونچا افسر ہے بیٹا پٹھو.....“ مرزا جی بولے لیکن یک دم مرزا کا چھوٹا سا چہرہ اور چھوٹا ہو گیا۔

”یہ تم دونوں کو کیا ہو گیا ہے؟ تمہیں اور مفتی کو.....“

”کیا ہو گیا ہے.....“

”ادھر اس حرامزادے مفتی کی زبان سوکھتی ہے ستارہ ستارہ کہتے۔ ادھر تو کچھ بھرن مچھسن قسم کا ہو گیا ہے ذرا سی بات سن کر.....“

مرزا صاحب سے کم از کم اتنی بات ضرور معلوم ہو گئی کہ جس بچے کی تلاش سارے ایئر پورٹ پر تھی وہ بچہ بالکل بخل میں کھڑا سامان کی پرچی تلاش کر رہا تھا۔ نام کے معلوم ہوتے ہی اشفاق نے شباب کے متعلق ایک بہت تفصیلی خط مفتی صاحب کو لکھا جس میں بار بار ستارہ کا لفظ استعمال کیا اور یوں ملٹری والوں کی طرح ایملر ڈوگ چارلی شوگر قسم کی ایک اصطلاح ہمارا کوڈ بن گئی۔

جہاں تک شباب کے لقب اختیار کرنے کا تعلق تھا ہم سب خوش تھے۔ لیکن اب جو مفتی صاحب نے اس نام کے تحت شباب کی شخصیت میں اولیا کے کرام کی صفات سے مستعار لے کر پھول پتیاں لگانا شروع کر دیں تو ہم سے برداشت نہ ہو سکا۔ سارے احکامات مفتی جی کی طرف سے آنے لگے اور ہم نے علاقائی حکومتوں کی طرح ان حکم ناموں پر خالص قسم کی عدم مطابقت کا عند کر لیا۔

مفتی جی کا خط آیا۔

جسمانی تکلیف ہے، ذہنی نہیں.....

مفتی

مہارانی!

اشارہ ہوا ہے

میری تنخواہ کا کیس کبھی طے نہیں ہو سکتا۔

میں مطمئن ہوں۔

مفتی

مفتی کا بغیر تنخواہ کے رہنا ہمارے لئے ایک بڑی اذیت کا باعث تھا لیکن اشارہ جو ہو چکا تھا اس لئے

ہم بھی مطمئن ہو گئے۔

پھر خط ملا۔

مہارانی!

عکسی سی ایس پی نہیں کرے گا۔

ستارہ نے کہا ہے اسی میں بہتری ہے۔

مفتی

عکسی کو سی ایس پی ضرور کرنا چاہئے تھا کیونکہ اس طرح ہمارے ملنے والوں میں ایک ڈی سی لڑکے کا اضافہ ہو جاتا، اور ہم جب اس کے علاقے میں جاتے تو ہماری بہت آؤ بھگت ہوتی اور چونکہ ہمیں عزت کروانے کا بہت شوق ہے اور یہ شوق اسی طور پر رہا ہو سکتا تھا اگر علاقہ بہ علاقہ ڈی سی صاحبان سے واقفیت ہو۔

لیکن مفتی جی نے اس خواب پر بھی بہتری کی چمکیلی چادر چڑھا دی.....

پھر خط ملا.....

مہارانی!

سارے جسم پر پھپھو لے نکلے ہیں۔

سخت عذاب میں ہوں کوئی دوا موافق نہیں آتی۔

ستارہ آیا تھا۔ کہنے لگا لرجی ہے۔ علاج چھوڑ دو۔

اب علاج کے بغیر صاحب فرماش ہوں۔

مفتی جی کے ان خطوط نے رفتہ رفتہ شباب کی صورت بگڑے ہوئے مسخ موعود کی کر دی۔ جو تھوڑا بہت امکان انہیں جاننے کا تھا وہ بھی جاتا رہا۔ اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ بچنے ہوئے لوگوں میں دو عیب ہوتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ وہ لوگوں میں رہ کر اللہ کو یاد کرتے رہتے ہیں۔ اور ہمیشہ خدشہ لاحق رہتا ہے کہ آپ کی پتہ نہیں کون سی رپورٹ اوپر کر دیں۔ دوسرے یہ کہ عموماً اللہ اپنے پیاروں کو آزمانے کا شوقین ہے اور ہم دونوں آزمائش سے بہت ڈرتے ہیں اگر اللہ کے چنیدہ لوگوں کے پاس رہے تو کون جانے کب آئے کے ساتھ گھن بھی پس جائے۔

شباب کی جو تھوڑی بہت محبت اشفاق سے ملی تھی اسے مفتی جی کی عقیدت کھا گئی اور اس طرح یہ تعارف اس آئینی تعارف تک محدود رہا جو علاؤ الدین کا پد منی سے ہوا تھا۔ اس تعارف میں دو شکاف موجود ہیں۔

ایک شکاف ماں جی کی ذات تھی اور دوسرا شکاف ثاقب ہے۔

مجھے ماں جی سے وہ ملاقات اب بھی یاد ہے جب ہم کراچی سے لاہور کا سفر کر رہے تھے۔

رات کا وقت تھا، صحرائی رات کی خشکی تھی۔ ماں جی کو غالباً اسی سردی کی وجہ سے نیند نہیں آرہی تھی اور وہ کھڑکی سے پشت لگائے سوچ پھیر رہی تھیں۔

”قدسیہ“ ادھر میری سیٹ پر اپنا کا کاڈال دے، دو بچے ایک سیٹ پر ٹھیک نہیں، کروٹ لے کر کوئی نیچے نہ آگرے۔“

”ٹھیک ہیں ماں جی۔ آپ فکر نہ کریں“

”مجھے تو نیند نہیں آرہی، اتنی کو ادھر ڈال دے میری سیٹ پر۔“

”ماں جی، ان کا کیا اعتبار۔ سوئے میں آپ کا بستر نہ بھگو دیں کیس۔“

”ادھر آ میرے پاس قدسیہ.....“

میں ماں جی کے پاس جا بیٹھی۔

”جس عورت کے ہانگ پر پیر پٹیاں نہ کرے، وہ عورت بد نصیب ہوتی ہے۔“

”جی ماں جی.....“

”وہاں میرے شباب کے گھر بھی بیٹا ہو۔“ ماں جی بولیں۔ ”اس کا بستر بھگونے والا بھی

جلدی آئے۔“

”ضرور ہو گاں جی.....“

”میرے شباب میں ایک خوبی ہے وہ جو کچھ بھی مانگتا ہے دوسروں کے لئے مانگتا ہے۔ میں جب بھی دعا کے لئے ہاتھ اٹھاتی ہوں اپنوں کے لئے کچھ نہ کچھ مانگتی ہوں۔ یہ فرق ہے..... اس میں اور مجھ میں.....“

میں چپ رہی۔

”شباب کو جیسا لوگ سمجھتے ہیں ویسا وہ نہیں ہے قدسیہ.....“

”جی ماں جی.....“

”انیق کو میرے بستر ڈال دے قدسیہ، دو بچے ایک سیٹ پر ٹھیک نہیں.....“

ماں جی نے وہ فرق نہ سمجھایا جو لوگوں کے سمجھنے اور اصلی شباب میں تھا۔

وہ دعا جو ماں جی اپنے لئے مانگ کرتی تھیں وہ شباب کے بیٹے ثاقب کے وجود میں پوری ہوئی۔ ثاقب کی تنہی آنکھیں اور اس کا گول گول وجود کبھی کبھی ایک ایسے شباب کی نشاندہی کرتا ہے جو ہمیشہ نگاہوں سے اوجھل رہا۔

ثاقب جب کسی آئے ہوئے مہمان کی طرف اشارہ کر کے عفت سے پوچھتا ہے ”امی یہ کب جائیں گے“ تو مجھے اس میں شباب کی بیزاری نظر آتی ہے جسے اللہ تعالیٰ نے پہلے ادیب بنایا پھر ایک ایسی نوکری پر مامور کیا جو بے سود فائیلوں پر دستخط کرنے کے سوائے اور کچھ نہیں۔ ضرورت مندوں کا ایک ایسا جھگڑا ان کے گرد قائم کر دیا جو پشاور کے بالانصرار سے بھی مضبوط ہے۔ اتنے سفران کی قسمت میں لکھ دیئے کہ اس سکون کا فائدہ ان ہو گیا جو بزرگوں کی میراث ہوتی ہے۔

ایکے شباب نے اسی بیزاری پر ہلکی سی مسکراہٹ اور بردباری کا غلاف چڑھا رکھا ہے۔ اور اس غلاف کے علاوہ ایک اور غلاف بھی ہے جس میں شباب نے اپنی گدڑی اور بنسری بھی چھپا رکھی ہے۔ جب کبھی ان کی پرواز بہت اونچی ہو جاتی ہے وہ اپنے نہ خانے میں اترتے ہیں۔ بوسیدہ غلاف کھوئی سے اتارتے ہیں اور اس بنسری اور گدڑی کو نظر بھر دیکھتے ہیں۔ پھر تاج سلطانی اور دبدبہ قاآنی باقی نہیں رہتا اور زمین پر ننگے پاؤں چلنے والوں سے محبت کرنا آسان ہو جاتا ہے۔ شباب کا سارا تھل، مٹھاس، بردباری اسی پوشتین اور بنسری کی زیارت میں چھپی ہے۔ ورنہ لارنس میں بیٹھ کر گنڈیریاں کھانا، سوار یوں کے تانگے میں نکالی سے لاہوری گیٹ تک سیر کرنے جانا، لکڑی کی کرسی پر بیٹھ کر بالی جٹی کا تھینڈو دیکھنا قریب قریب ناممکن ہو جاتا۔ اور پھر ان کی شخصیت میں وہ وسعت پیدا نہ ہو سکتی جو نیک اور بد پر لیبیل نہیں لگاتی اور دوسروں کی کمزوریوں کو اپنی ترقی کا زینہ نہیں بناتی جو چشم پوشی کرتی ہے اور بھول جاتی ہے اپنے احسان بھی

عفت شباب

اور دوسروں کی احسان فراموشی بھی۔

احسان کرنے اور احسان فراموش کرنے والوں کو بھول جانے میں غفت شہاب کے ساتھ ساتھ چلتی ہے اور یہی وہ پل ہے جو ان دونوں کناروں کے درمیان بوڈا پست کے پل کی طرح ایستادہ ہے اور ایک شہر کو دوسرے شہر سے ملاتا ہے۔

غفت شہاب کے ساتھ ساتھ رہتی ہے بالکل جس طرح بی آئی اے کا طیارہ دھرتی کے ساتھ ساتھ چلتا ہے۔ وہ شہاب کو اسی نظر سے دیکھتی ہے جس طرح ہوائی جہاز کی بیضوی کھڑکی سے دھرتی کا منظر نظر آتا ہے۔ چھوٹے چھوٹے ندی نالے، چوکور مستطیل کھیتوں کے ٹکڑے، ماچس کی ڈبیوں کے ڈھیر جیسے شہر، کنکھجور سے پہاڑ اور سرے کی لکیری سڑکیں۔ آسمان کی بلندی سے دھرتی کا ایک سارنگ ہوتا ہے۔ ہلکے نیلے رنگ میں لپٹا ہوا غاکستری رنگ..... مشرقی انسان کا رنگ۔ غفت کبھی شہاب کا تجربہ نہیں کرتی۔ وہ شہاب کو بدل کر ایک اور شہاب بنانا نہیں چاہتی۔ اس نے کبھی اس دھرتی رنگے آدمی کے شہروں، دریاؤں اور پہاڑوں کو دور میں لگا کر نہیں دیکھا۔ وہ اس دنیا کے مشرقی آدمی کا ایک ملا جلا رنگ دیکھتی ہے اور اس رنگ پر اس لئے اعتماد کرتی ہے کہ اس رنگ سے روئیدگی کا پیام ملتا ہے۔ اس سے رحم کی خوشبو آتی ہے۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے ایک رات جب شہاب ٹوپی پارک میں مقیم تھے میں ان کے گھر گئی تھی۔ اکتوبر کا آغاز تھا۔ ان کے پچھلے برآمدے میں جہاں مکان سے قدرتی ڈھلوان شروع ہو کر دور وادی تک کا منظر نظر آتا تھا۔ اسی برآمدے میں رات گئے تک میں اور غفت بیٹھے شہاب کا انتظار کرتے رہے۔ بالآخر غفت نے کہا..... ”ایک ہی آدمی میں اتنی صبر آزما خاصیتیں نہیں ہونا چاہئیں۔ انسان اس کا ساتھ دیتا دیتا تھک جاتا ہے۔“

”میں تمہارا مطلب نہیں سمجھی.....“ میں نے پوچھا.....

غفت نے لمبی سانس لی اور بولی..... ”دراصل شہاب قصور وار ہوتے ہیں۔ لیکن ان پر غصہ اس لئے نہیں آسکتا کہ قصور وار ہونے کے باوجود قصور ان کی ذات کو ملوث نہیں کرتا۔ وہ مجھ سے غافل ہوتے ہیں لیکن اس کے یہ معنی نہیں ہوتے کہ وہ مجھ سے غافل ہیں۔ ایسے آدمی کو کوئی کیا کسے جس کا ہر بہار میں ہر گھڑی میں ایک سارنگ رہتا ہے“ ایسے آدمی کی شاید ایک ہی خوبی ہو کرتی ہے۔ اس پر اعتماد کیا جاسکتا ہے۔ اور غفت شہاب پر اعتماد کرتی ہے جس طرح کسی زمانے میں چین کے لوگ اپنی دیوار پر بچھروں سا کرتے تھے۔

مجھے افسوس ہے کہ میرا شہاب سے ابھی تک تعارف نہیں ہے۔ میں نے تو فقط فیشن کے تحت مضمون لکھنا قبول کر لیا تھا۔

میں نے شہاب کو ان تین کناروں کی آنکھوں سے دیکھا جو دلمیں بنی ہاتھوں میں مہندی رچائے بیٹھی رہیں اور جب مسیحا کی رات آئی تو وہ تینوں سوئی رہیں اور دو لمبا چلا گیا۔ میں نے انہیں اس اشفاق کی آنکھ سے دیکھا جو اپنی ہر محبت پر اپنی ہی مرگ کا کراسے ہمیشہ کے لئے محفوظ کر لیتے ہیں۔ میں نے انہیں اس جگہ گرومنٹی ہی کی نظر سے دیکھا جو سولڈر کرنے والوں کی عینک چہرے پر لگائے شہاب کی شعلہ رو شخصیت دیکھتا رہا۔ میں نے انہیں غفت کی نگاہ سے دیکھا جو ایک ڈاکٹر کی نگاہ ہے۔ مجھ میں ابھی وہ ضبط و انتظام موجود ہے جو اندھے شیشے کی طرح ہوتا ہے اور جس کے ہوتے ہوئے نہ کسی اور کی شخصیت کے پرت کھلتے ہیں نہ اپنی حد کا پتہ چلتا ہے۔

میرے لئے شہاب اجنبی ہیں۔ میں سب سے پہلے کا وقت ہوں اور وہ دو پہر یا کا پھول ہیں۔ میرے ہوتے ہوئے وہ پر قبیح کی بکری کی طرح سے رہتے ہیں۔ ان کا چہرہ بیکرٹ اینکٹوں کی طرح دائرہ پر فرتا ہے اور اس چہرے تلے سوچ کی گھڑی کس طرح چلتی ہے اس کی کچھ خبر نہیں ملتی۔

لیکن میرا جی چاہتا ہے کہ اشفاق کے جملہ حلقہ گوشوں کی طرح کسی روز شہاب بھی دلگیر سے ہو کر مجھ سے اشفاق کی بے اتفاقی کا ذکر کریں۔ اپنے گھریلو جھگڑوں کی گتھیاں کھولیں اس عمدہ کا ذکر کریں جب انہیں پہلی بار عشق ہوا تھا اور انہوں نے دھتورے کا دودھ نکال کر پینے کا پروگرام بنایا تھا۔ پھر میں بڑی اونچی بن کر کہوں..... ”شہاب بھائی، دراصل آپ اونچی جگہوں سے خوفزدہ ہیں۔ دوستوں کی آپ سے بے اتفاقی اس بات کی مظہر ہے کہ آپ کے بچپن کی الجھنیں ابھی ناشگفتہ حالت میں آپ کے اندر Octopus کی صورت زندہ ہیں۔ آپ کے گھریلو جھگڑے معمولی ہیں صرف آپ کی اذیت پسند طبیعت اس طرح کے اعجاز تعمیر کرتی رہتی ہے تاکہ آپ جنسی آسودگی محسوس کر سکیں۔ آپ کا پسلا عشق اتنا اہم نہیں جتنا آپ اسے سمجھ رہے ہیں۔ بات صرف اتنی ہے کہ آپ مجھ سے پرندے کی طرح خود تری کا شکار ہیں۔ اور اس خود تری سے اور کئی چشمے نکلنے ہیں.....“

ابھی تک یہ وقت نہیں آیا اور نہ میرا مضمون زیادہ دلچسپ ہوا اور آپ اس شہاب کو بہتر طور پر جان سکتے جس نے اپنے چہرے پر ماسک پہن رکھا ہے اور ماسک پہننے کے بعد اسے اتارنے کا ڈھنگ بھول چکا ہے.....“

قریباً اٹھائیس سال پرانا یہ مضمون میں نے فقط اس لئے شامل تحریر کیا ہے کہ آپ کو یقین دلاؤں اس لیے عرصے میں گویا ہمارے مراسم بڑھے، ہمیں ان کے ساتھ زیادہ وقت ملا۔ لیکن شہاب بھائی کے تعارف میں اضافہ نہ ہوا۔ پہلے سنی سنائی پر شناخت موقوف تھی۔ اب حوالے بدل گئے ہیں لیکن گمیان میں اضافہ نہیں ہوا اب میں نے مضمون جی، خان صاحب اور غفت کی عینک لگا کر انہیں دیکھا۔ اب دیکھنے کے زاویے بدلے ضرور ہیں لیکن ناواقفیت کا وہی عالم ہے۔

کسی شخص کے قریب ہونے کا ڈرن کر اظہار ہے۔ آپ اپنی کہیں اور دوسرے کی سنیں، افہام و تفہیم ہو، ڈائلاگ چلے، نظریے سمجھ جائیں اور اظہار کے دوران سمجھ میں آنے لگے کہ فلاں شخص کیا سوچتا ہے؟ کیا چاہتا ہے؟ اس کی آرزوئیں کیا ہیں؟ وہ آپ سے کیا توقعات وابستہ رکھتا ہے؟..... اظہار ہی کے ذریعہ پتہ چلتا ہے کہ وہ شخص جس سے آپ واقفیت پیدا کرنا چاہتے ہیں آپ کے مطلب کا آدمی ہے بھی یا نہیں۔

ممتاز مفتی اور یو این او افہام و تفہیم کے دو ادارے ہیں۔

مفتی جی کو گوگلے لوگ پسند نہیں اور اللہ کی کرنی کہ وہ قدرت اللہ شباب سے وابستہ ہو گئے۔ جو بالکل اظہار کے بندے نہ تھے۔ دس اگست ۱۹۶۹ء کو نوٹنگھم سے شباب بھائی نے مجھے ایک خط لکھا۔ مفتی جی کی ضخیم کتاب ”علی پور کالیلی“ کا دوسرا ایڈیشن آ رہا تھا اور اس کی تقریب رونمائی کے سلسلے میں ایک جلسہ ہونے والا تھا۔ شباب بھائی نے اپنے خط میں مفتی جی کے بارے میں جو کچھ لکھا اسے رقم کرتی ہوں.....

”اگر علی پور کالیلی واقعی ممتاز مفتی ہے تو پھر وہ نوجوان بوزھا کون ہے جو نئے بچوں کا گھوڑا بن کر گھٹنوں تک گھٹنوں کے بل رینگتا رہتا ہے؟۔ وہ نحیف و نزار انسان کون ہے جو ایک آدمی..... ایک عورت نہیں..... ایک آدمی سے محض سرسری سی، محض فروغی سی ملاقات کا وعدہ وفا کرنے کے لئے کڑکراتی ہوئی سردی اور موسلا دھار بارش میں ایک ناقابل اعتماد پھینچ پھینچ کر بائیکل پر اندھیری رات میں سولہ میل جانے اور سولہ میل آنے کا تعجب یوں خندہ پیشانی سے برداشت کرتا ہے جیسے آتش دان کے سامنے بیٹھا بایں ہاتھ سے چٹکی بجا رہا ہو..... وہ عیش پسند درویش جو تمباکو والے چند پان کھا کر اور چائے کے چار پیالے پانی کر زندگی کے صبح و شام بڑی تن آسانی سے گزار دیتا ہے؟۔ وہ ایذا طلب سنیا سی جو رنج کے لئے رخت سفر باندھتا ہے تو احرام کی مدت کے لئے تمباکو والے پانوں کی لذت کو بھی یوں ہی بلاوجہ تیاگ دیتا ہے؟ وہ بے راہ رو حسن پرست جسے مکہ اور مدینے میں کالی آنکھوں اور سنہری بالوں والی کنکن کی طرح دھکتی، تانبے کی طرح دیکتی اور گلاب کی طرح مسکتی، شامی، تری، مصری اور مجازی عورتوں کی قطاریں ایک بار بھی نظر نہیں آئیں؟..... وہ اذیل ساہٹ دھرم ضدی بندہ جو اپنے اللہ کے سامنے بے نیاز اور اپنے رسولؐ کے حضور عاجز ہے.....

باقود سیر، دراصل یہ سوالات میں یونہی بلاوجہ اور بے ضرورت پوچھ رہا ہوں..... شاید محض زیب داستان کے لئے۔ ورنہ سچ تو یہ ہے کہ جب میں پہلے پل ممتاز مفتی سے ملا تو میں نے

فوراً فیصلہ کر لیا کہ بس یہ آدمی ضرور میرے ذہب کا ہے۔ مگر مجوشی وہ جیسے گندھک کا ابلتا چشہ، سرد مری ایسی گویا جمہوا گلشیر، نری میں روئی کی جتی جو مدت سے مٹی کے دیے میں سرسوں کے تیل میں گری پڑی ہو، ختی میں نائی کا استرا، مٹھاس کا موڈ ہو تو رس کا گھڑا ورنہ زرا پر کارو کھچکا کھدر سالا تعلق انسان جو اپنے دل کی کڑوی سے کڑوی لیکن سچی بات یوں کہ گزرتا ہے جیسے موسم کا حال بیان کر رہا ہو۔ یہ تو بھلا ہوا فسانہ نگاری کا، کہ اس فن نے ممتاز مفتی کو بیان کا وہ اعجاز عطا کر رکھا ہے کہ اس کی ہر حقیقت پر افسانے کا گمان ہونے لگتا ہے اور ہر افسانے پر حقیقت کا..... اگر فن کا یہ چور دروازہ ممتاز مفتی کو راہ نہ دیتا تو اب تک وہ کبھی کا جراتم پیشہ سرگرمیوں میں ماخوذ ہو کر کیفر کردار تک پہنچ چکا ہوتا یا کاہ کاراہ گیروں کو پکڑ پکڑ کر گھیر گھا کر بڑی منت سماجت، بڑی لجابت سے نماز پڑھنے کی تلقین کیا کرتا اور اگر کوئی سادہ لوح مسافراس کی باتوں میں آکر باقاعدہ وضو کر کے نماز کی نیت باندھ بھی لیتا تو ممتاز مفتی نہایت بے اعتنائی سے سگریٹ سلگا کر الگ تھلک بیٹھ جاتا اور دل ہی دل میں تعجب کرتا کہ اللہ کی بھی کیا شان ہے کہ ابھی تک ایسے ایسے اچھے لوگ موجود ہیں جو ہنسی خوش نماز تک پڑھ گزرتے ہیں!.....

یہ بات نہیں کہ ممتاز مفتی کسی قسم کے عقیدے میں گرفتار ہے۔ وہ تو ایک ایسا آزاد منہش ہے جو عقیدے کا روگ پال ہی نہیں سکتا۔ اس کے سارے وجود میں عقیدہ نہیں بلکہ عقیدت جاری و ساری ہے۔ عقیدت بھی وہ جس میں حدت بھی خوب، شدت بھی خوب اور جدت بھی خوب! اب اس عقیدت کا شکار کون ہوتا ہے اس کا دار و مدار یا حسن اتفاق پر ہے یا محض حادثے پر..... اگر عورت ہے تو جنس، دوست ہے تو محبت، دشمن ہے تو نفرت..... اور جب کسی وقت ممتاز مفتی کی عقیدت کے جال میں نہ عورت پھنسی ہوئی ہو، نہ دوست اور نہ دشمن تو وہ اچانک راہ چلتے چلتے کسی میرے جیسے لاوارث کو آنکھ بچا کر اٹھا لیتا ہے۔ اسے گود میں بٹھاتا ہے، کندھوں پر اٹھاتا ہے، کھلاتا ہے، پلاتا ہے، پالتا ہے، پوستا ہے، بال بڑھ جائیں تو کٹواتا نہیں بلکہ لائی لائی زلفوں پر گوئے کناری والا برٹملر کا صاف باندھ دیتا ہے۔ داڑھی نکلے تو اس پر مشک کا فوری نکلیاں سجا دیتا ہے، آنکھوں میں دنبالہ وار سرمہ لگا دیتا ہے اور پھر اسے میدان میں نکال کر با آواز بلند کہتا ہے ”کہ ہاں بچہ جمورے تمہارا نام کیا؟..... تمہارا کام کیا؟..... تمہارا دام کیا؟“

بہ امر مجبوری بچہ جمورے صبح جواب دیتا ہے لیکن اگر کوئی جواب ممتاز مفتی کی عقیدت کے سائے میں پورا نہ اترے تو وہ اندر ہی اندر اسے ایسے خفیہ گھونٹے مارتا ہے کہ بے چارہ بچہ جمورا

بس وہی کہنے لگتا ہے جو ممتاز متی کی عقیدت چاہتی ہے کہ وہ کہے.....

عقیدت کے میدان میں ممتاز مفتی وہ خراکار ہے جو معصوم بچوں کو اغوا کر کے ان کی انگلیاں توڑتا ہے، ان کی ہڈیاں مروڑتا ہے تاکہ وہ اس کے اور صرف اس کے سانچے میں فٹ ہو سکیں۔ شریعت میں وہ خاموش ہے کیونکہ اسے اپنے رسولؐ سے ایسا انس ہے جو شاید ضرورت کے بغیر بھی پھل کو پانی سے ہونا چاہئے..... طریقت میں وہ بے شک بڑا طر حدار ہے، اگر تصوف میں غنڈہ ایک نافذ ہوتا تو ممتاز مفتی داعی ضمانت پر زندگی گزارتا..... مرنے کے بعد اگر وہ جنت میں گیا تو شاید اسی وجہ سے جائے کہ آخر وہاں کی جیلیں بھی تو کسی نے آباد کرنی ہیں۔

یوں روزمرہ کی زندگی میں ممتاز مفتی سرکس کا ”سانے مار“ ہے۔ وہ ہر وقت لنگر لنگوٹ کے، بدن پر تیل ملے، سدھے سدھائے ہاتھوں اور بندھے بندھائے شیروں کو سانے مار کر مزید سدھارتا اور مزید باندھتا رہتا ہے۔ ”علی پور کالی“ اسی سرکس کی ایک جھلک ہے۔“

اس خط سے ممتاز مفتی کی جو جھلک آپ نے دیکھی اس میں اضافے کے لئے ایک اور خط کا حوالہ پیش کرتی ہوں.....

۱۵ ستمبر ۱۹۷۰ء

بانو بہن!

بورڈ کی میٹنگ میں ایک خوبصورت سی لڑکی نے ابھی ابھی آپ کا خط مجھے لا کر دیا ہے۔ پتہ نہیں کس کا شکریہ ادا کروں۔ فی الفور جواب لکھ رہا ہوں۔

مفتی جی کی باتوں پر زیادہ نہ جائیے، وہ بڑے آدمی ہیں۔ بڑے ہیں کیونکہ ز آدمی ہیں۔ مجھے نہ پیری پسند ہے نہ فقیری۔ میں تو محض ایک سیدھا سادا ساعیش پسند انسان ہوں۔ جب عیش میسر ہو تو اللہ کا حسان ہے جب نہ ہو تو بھی اس کی دین ہے۔ پتہ نہیں کس طرح..... لیکن کسی طرح کھینچ کھانچ کر اب میں اس منزل تک پہنچ گیا ہوں جہاں مدح و ذم یکساں ہیں۔ اس منزل میں میری واحد آزمائش مفتی جی ہیں۔ وہ چابک مار مار کر حکم دیتے ہیں کہ اپنی تعریف سنو اور خوش رہو۔

میں تعریفیں..... سنتا ہوں اور خوش ہوتا ہوں..... لیکن جب کوئی میرے خلاف کچھ کہتا یا کرتا ہے اس پر بھی واللہ رنجیدہ نہیں ہوتا۔

آپ کا بھائی

قدرت اللہ شاہ

یہ دونوں خطر رقم کرنے سے میری مراد یہ تھی کہ آپ خود دیکھ لیں کہ اظہار کس قدر بڑا حجاب ہے۔ مفتی جی اور یو این او کی پالیسی کتنی الجھا دینے والی ہے۔ شباب بھائی نے جتنی خوبی سے مفتی جی کی شخصیت کو اجاگر کیا ہے اس سے کہیں زیادہ چابکدستی سے اظہار ہی کا سارالے کراچی ذات پر پردہ ڈال گئے ہیں۔ شباب بھائی سے قدرت اللہ شاہ کی باتیں کرنا ایسے ہی تھا جیسے دائروں میں گھومنا، اندھیرے میں ٹٹولنا، زیر آب تیرنا، ہجوم میں کسی ایسے شخص کو تلاش کرنا جو گروہ میں موجود ہی نہیں۔ گو اظہار کا وسیلہ اور افہام و تفہیم کا اصول شباب بھائی کو جاننے میں مدد نہیں دے سکا۔ لیکن مفتی جی کے کچے اویب ہیں۔ ان کا ورڈ ہنا چھوٹا سونا جاگنا سب لفظ ہے۔ وہ جب بھی سوچتے سمجھتے جانتے ہیں لفظوں کا سارالیتے ہیں اسی لئے ان کے اور میرے درمیان ایک عرصے سے صرف تین لفظ زندہ ہیں۔

قدرت اللہ شاہ.....!

ہم دونوں پہلے اس موضوع پر اتفاق کرتے ہیں پھر جھگڑتے ہیں۔ مفتی جی کبھی مجھے حلقہ ارادت سے نکال پھینکتے ہیں کبھی دلار سے دوبارہ دوزانو ہونے کا حکم دیتے ہیں۔ قدرت اللہ شاہ مفتی جی کی ملکیت، ان کا مسلک، نظریہ، آگن، تکیہ، چوپال، گھر، وجہ زیست سب کچھ ہے۔ میں ناری ہوں دنیا سے بندھی ہوں اولاد پالنے کے فریب میں مبتلا ہوں۔ بچی بھگتی کو دھرم سمجھتی ہوں۔ میرے لئے راستے کے کئی حجاب ہیں۔ مفتی جی کو ان چلنوں سے بڑی گھبراہٹ ہوتی ہے۔ وہ مجھ جیسی عارف دنیا کو عارف مولیٰ بنانے میں کچھ اس درجہ اصرار اور شدت برتتے ہیں کہ میں بدک جاتی ہوں اور مفتی جی کو اپنی قلوبی اپنی نیام میں واپس دھرنی پڑتی ہے۔

جن دنوں شباب بھائی ہاتھ آئی لینڈ میں مقیم تھے اور اسکندر مرزا کے سیکرٹری تھے ہم غریب نادار میاں بیوی کئی رضائیاں گدے لپیٹ تبت کا بسزما ہول ڈال میں باندھ کراچی گئے تھے۔ جو کچھ ہمارے ساتھ ہوئی اس کی روئیداد آپ پڑھ چکے ہیں۔ مفتی جی نے وہیں خان صاحب پر یہ الزام لگایا کہ اشفاق افسر باز، اقتدار پسند اور جھولی چک آدمی ہے..... کراچی ہی کے قیام میں مجھ پر صرف اتنا کھلا کہ شباب بھائی بڑے جھینڈو، کم گو، شرمیلے اور ہلکے ہلکے سے بے ضرر شرارتی آدمی ہیں۔

کراچی کے بعد کئی سال مفتی جی سے شباب صاحب کی کوئی بات نہ ہوئی۔ وہ اسلام آباد منتقل ہو گئے۔ جوں جوں ان کا تعلق شباب صاحب سے مضبوط ہونے لگا مفتی جی کو خوش کرنا مشکل کام بن گیا۔ مفتی جی بڑے روایتی مہمان نواز ہیں۔ لیکن وہ چاہتے ہیں کہ لوگ انہیں غیر مقلد اور بے پروا سمجھیں۔ وہ ایک عرصہ تک صبح و شام شباب بھائی کو پان لگا کر دینے جاتے رہے۔ ہم اسلام آباد جاتے تو مفتی جی پڑیوں میں پان لپیٹ کر خان کو بھی دینے آ جاتے۔ اس دستوری پر اگر ہم شکریہ ادا کر بیٹھتے تو مفتی جی کہتے..... ”اوئے بٹے ہم سے خاطر داریاں نہیں ہوتیں، دنیا داریاں نہیں بھیتیں“۔

مفتی جی کو اپنے دوست بڑے پیارے ہیں۔ پروہ ان دوستوں کی کج ادا میاں برداشت نہیں کر سکتے۔ جتنا ان کا تعلق گرا ہوتا ہے اسی قدر وہ دوست کو اپنے دست قدرت میں رکھنا چاہتے ہیں۔ دوست اپنی مرضی، طبیعت، مسلک، حالات، عمر کے تقاضوں کے تحت فعال نہیں ہو سکتا۔ دوست کو ہر گز ہر گز یہ اجازت نہیں ملتی کہ کبھی وہ بھی کینہ، غصیل، 'احق'، جھوٹا، دل بھینک، غیبت باز اور بے فیض ہو جایا کرے۔ شباب بھائی کے قرب نے مفتی جی میں انسانی کمزوریوں کے لئے حوصلہ کم کر دیا ہے ان کے پاس جب سے سونے کا گز آیا دوستی کی ساری بڑائی فیل ہو گئی اب تمام دوست کوئی گرہ کم ہے کوئی انچ زیادہ جو مفتی جی محسوس کرتے ہیں کہ فلاں دوست ان کے گز پر تانے کے قابل نہیں وہ اپنی پھیٹیوں کا سلسلہ شروع کرتے ہیں۔ پہلے القاب بدلتا ہے پھر تحریر میں تو سے آپ کا تکلف شروع ہوتا ہے۔ دوست ان تنبیہی خطوط کے باوصف پھر بھی چھوٹا، دنیا دار اور کمزور رہنے پر مصر رہے تو مفتی جی اسے بینک بنی اور دو گوش آنگن بدر کر دیتے ہیں۔ اور پھر دل ہی دل میں سوچتے ہیں کمال ہے اتنی چھوٹی سی بات نہیں سمجھتا آخر شباب بھی تو ہے..... کیا آدمی ہے کیا بات ہے؟۔

سونے کے گز سے سب سے زیادہ نقصان 'بے قدری'، حق تلفی، عسکی مفتی اور اشفاق احمد کی ہوئی۔ یہ دونوں مفتی جی سے اتنی زیادہ محبت کرتے ہیں کہ انہیں چھوڑ نہیں سکتے۔ مفتی جی کے بے نوک عثمانی خطا پاکر مضحمل ہوتے ہیں۔ لیکن اپنا آپ بدل نہیں سکتے۔ عسکی سمجھ نہیں سکتا کہ اس کا باپو اسے سونے کے گز سے کیوں ناپ رہا ہے۔ خان سمجھ تو جاتے ہیں لیکن مفتی جی کی اس بے سمجھی پر ان کا اختیار نہیں چلتا۔ عسکی مفتی اور اشفاق احمد کی توقف اتنی خواہش ہے کہ مفتی جی بس انہیں بونے سمجھ کر آنگن میں پھیل کود منانے دیں ہر درخت کی ڈالی پر چڑھ کر ایک ہاتھ سے ڈالی پکڑ کر زور سے ہلائیں اور کہیں "لک مفتی جی نوپینڈز..... نوپینڈز....." لیکن مفتی جی نہ تالی بجاتے ہیں نہ خوش ہوتے ہیں۔ وہ ان دونوں کا ایک اور بیورو کریٹ سے مقابلہ کرتے ہوئے دل میں زچ ہو کر کہتے ہیں "فیوڈل لارڈز..... بیورو کریٹ..... کمپلیس..... شو آف..... سیلف میڈ بونے"۔

قیام پاکستان کے بعد جو پود بڑے شہروں میں پناہ گزین ہوئی ان لوگوں میں جواں سالوں پر عجیب اثر ہوا۔ وہ مسائل سے نشہ نشہ جوں توں اپنے پیروں پر کھڑے ہو گئے اور جوہنی انہیں اپنے دست و بازو پر اعتماد پیدا ہوا ایک پوری کھپ سیلف میڈ افسر کلاس، 'برنس مین'، شاعر، 'ادیب'، 'ایکٹروں'، 'ڈانکروں' کی پیدا ہو گئی۔ پاکستان میں ہر رو فیشن میں جو لوگ بالکل چوٹی پر نظر آتے ہیں وہ عموماً سیلف میڈ ہیں۔ عسکی مفتی اور خان صاحب بھی سیلف میڈ ہیں۔ ان میں اور شباب بھائی میں ایک بنیادی فرق یہ بھی تھا۔ شباب بھائی کبھی میڈ تھے ہی نہیں۔ وہ پری میڈ آئے تھے انہوں نے دنیاوی اعتبار سے کبھی کچھ کرنے، بننے، آگے بڑھنے، پیچھے رہ جانے، جھنڈا گاڑنے، متاثر ہونے یا کرنے کے لئے اصرار یا تلاش نہ کی تھی۔ وہ بس پیدل مسافر کی طرح چوڑی کے سرے پر روٹی کی پوٹلی باندھے چلتے رہتے تھے جو کچھ راستے میں

آ جاتا، 'گر گزرتے۔ چاہے یہ آئی سی ایس کا امتحان ہوتا یا چندرا وائی کی کثافت بھری بوریاں دھوٹا..... چاہے یہ اسرائیل کا سفر ہوتا یا ہیک کی ایمبسڈری..... وہ تلاش، اصرار، تجویز، اہتمام کے بغیر، جو بھی کام بھروسہ ہوتا توجہ، خوش دلی اور محبت سے کر دیتے۔ جس قدر کام لاطفاتی سے کرتے اتنا ہی وہ مدح و ذم کے چکر سے نکل جاتے۔ "شباب نامہ" پبلک میں عام ہونے سے پہلے انہوں نے پردہ کر لیا تاکہ اس سے حاصل ہونے والی تعریف ان میں مدح کا شتیق پیدا نہ کر دے۔

برصغیر میں عموماً چار خوبیاں یکجا ہوں تو راوی چین ہی چین لکھتا ہے ورنہ اپنا آپ منوانے کے لئے تقابل کے پیلے میں اپنی ہی بانہ ڈال کر محنت کا رس نکلوانا پڑتا ہے۔ اگر انسان امیر ہو، انگریزی کے لہجے پر عبور ہو، گورا چٹا، خوبصورت اور اونچی ذات والا کلائے توان چار خوبیوں کے باعث ہمارے معاشرے میں وہ اڑتا سا بن سکتا ہے، اگر دو ایک کو آف کم ہوں تو تھقی لڑتا ہے اور اپنے آئی کیو اور محنت کا سہارا لے کر سیلف میڈ آدمی بن جاتا ہے..... ہمارے معاشرے میں ایک مدت سے اپنی بڑائی کے یہ چار تعویز کام آتے رہے ہیں۔ جس شخص کے پاس ان کی کمی ہو اس کی عزت ہمارے معاشرے میں بحال نہیں رہ سکتی۔ فقط متقی پریز گارے ضرر انسان ہو تو ہمارے معاشرے میں لوگ اسے ایویں کو بیس ہی سمجھیں گے۔

سیلف میڈ آدمی کی آتش بازی احساس کمتری کی تیلی سے سلگتی ہے اور سالہ ختم ہونے کے بعد بھی شعلے جھاڑتی رہتی ہے۔ مسٹر سیلف میڈ زندگی میں اتنی ٹھوکریں، کشمکش، مشکلات، زیادتی، دھاندلی، نکتہ چینی سمجھتا ہے کہ اس ٹین کے کنٹر میں چب پڑ جاتے ہیں۔ جیسے وہ اونچے پہاڑ کے پتھروں سے ٹکراتا آیا ہو..... سیلف میڈ ایک خاص ڈھب کا آدمی ہوتا ہے کیونکہ اس کی بنیادی پرورش بڑی روایت پسند، سادہ مرادی عورت نے کی ہوتی ہے جو اسے پھوٹوں سے پیار، بڑوں کا ادب، ماں کے پاؤں تلے جنت، عورت کا ڈولی میں آنا اور کندھوں پر جانا وغیرہ وغیرہ قسم کے نظریات کی چھواں تلے پالتی ہے۔ لیکن رفتہ رفتہ ترقی کی دیوی وقت اور پوزیشن کے ساتھ ساتھ اسے فقط Information oriented بنادیتی ہے۔ ماں کے نظریات پر اس کا ایمان نہیں ہوتا اور انفریشن اس کا حال نہیں ہوتی۔ اس نظریاتی دورخی کے باعث سیلف میڈ لوگ عموماً دو حصوں میں بٹ جاتے ہیں۔ ایک ان کا خود مختار سیلف ہوتا ہے۔ جسے پروفیشن میں کامیابی بانجھا چڑھاتی ہے اور ایک ان کے اندر کا برا ملکر چوڑے جوہر بجلی کے بلب کے پاس جا کر اس لئے رک جاتا ہے کہ اس میں اسے عافیت، گرمی اور مانتا نظر آتی ہے۔ سیلف میڈ آدمی کی مشکل یہ ہے کہ اپنے دو سیلف لے کر دور استوں پر چلتا ہے اور یہ راستے کیس نہیں ملتے۔ وہ فل لوڈ کار میں انگریزی موسیقی بھی سنتا ہے اور نوک کلچر میں بھی اس کی جان بچھری رہتی ہے۔ دانشور کی تمام جھکنڈوں سے لیس ہو کر جنگ ہر صورت وہ معصومیت کی جیتنا چاہتا

ہے۔ دن بھر جب یہ کاغذی شیر آرڈر دیتا، آگے بڑھتا، مشورے پھینکتا، جھڑکیاں سناتا، کافی منتشر حاصل کر لیتا ہے تو اپنی سوگوار شامیں کسی کلب، ڈانکڑ کے کلب، ٹی وی کے آگے، چوری کے معاشرے، ہاٹ دائر بائل، بچوں کی خوشامد، ٹرانکولائزر احساس جرم کے حوالے کر دیتا ہے۔ جب ان ساروں سے بھی تھکی نہیں ملتی تو سردیوں کی رات کے پچھلے پہر وہ دکھوں کا کبیل ذرا سا پھرے سے اٹھا کر کتا ہے۔

تاروں والی رات کے نیچے جاگتے جاگتے رات کئی

دن نکلا تو کار جہاں کو جوں توں بھی اپنانا ہو گا

شع کا چہرہ زرد ہوا ہے خاک پہ رکھو پیشانی

کہہ دو درد دیا تو دانا ورماں بھی بتلانا ہو گا

مفتی جی سچے کھرے اور محبت کرنے والے آدمی ہیں۔ انہیں کسی سیلف میڈ آدمی پر زیادہ دیر محبت نہیں آتی۔ وہ مور کا ناچ دیر تک دیکھ نہیں سکتے لیکن شباب بھائی لک ماٹو بیڈیروالے انڈر ڈوگ، بھرن مچھن کمزور سیلف میڈ آدمی کے ساتھی تھے۔ شباب بھائی تمام پیواؤں اور قیہوں کے دل سے ہمدرد تھے۔ انہیں کمزور آدمی کی بیساکھی بننے کا شوق تھا۔ شرابی، لپائیا، رانندہ درگاہ ان کے نزدیک ہمدردی کا مستحق تھا۔ اپنے سے مختلف مسلک والے کی ان سے خوب ہمتی تھی۔ وہ اختلاف اور تضاد کے باوجود ہمدردی بانٹ سکتے تھے۔ محبت کر سکتے تھے۔

اسی لئے پہلی نظریں انہوں نے سیلف میڈ عکسی مفتی کا انتخاب کیا اور ہمیشہ اپنی محبت کی لوٹی سے اسے ڈھانپے رکھا۔ وہ جب بھی عکسی کی بات کرتے ان کا لہجہ مامتا سے بھگیا ہوتا کیونکہ وہ جانتے تھے کہ عکسی پیوہ بھی ہے اور یتیم بھی..... پیوہ وہ اس لئے تھا کہ بے سارا تھا اور یتیم وہ اس ضمن میں تھا کہ اتنے بڑے باپ کا بیٹا باپ کی شکل ایسے ہی دیکھتا تھا جیسے جہلم کی پٹیاں ماؤنٹ ایورسٹ کو دیکھتی ہیں اور اس کا کچھ بگاڑ نہیں سکتیں۔

ان دنوں ہم ماڈل ٹاؤن میں سرکلر روڈ سے کچھ پیچھے ہٹ کر جی۔ ۷۵ میں رہتے تھے۔ عکسی نیا نیا چیکو سلواکیہ سے ہو کر آیا تھا۔ اس کی آواز میں امید، چال میں ہمت اور پروگراموں میں جذبہ تھا۔ لیکن نوکری کہیں آس پاس نہ تھی۔ عکسی بیس پینچس دن ہمارے پاس رہ کر جب چلا گیا تو مجھے خوف آنے لگا۔ وہ اتنا پر امید اور مغربی نظر آ رہا تھا کہ مجھے ڈر تھا کہیں ہمارے مشرقی ماحول میں اس کا مستقبل مخدوش نہ ہو جائے۔ ان ہی دنوں عفت اور شباب بھائی ہمارے گھر آئے۔

چھوٹے سے کھانے کے کمرے میں، جہاں گلابی پردوں کی روشنی میں عفت کا چہرہ عنابی شامی لگ رہا تھا میں نے کچھ جھج کر عکسی کی بات کی۔ شباب بھائی کی آواز چہرہ ہاتھ سب ماں کے بن گئے وہ پریم بھری آواز میں بولے..... ”آپ فکر نہ کریں عکسی کے لئے ہو رہا ہے۔“

”کیا شباب بھائی؟“



عکسی مفتی، قدرت اللہ شباب، تنبیذ مفتی

”بس ہو رہا ہے۔۔۔۔۔“

”کیا آپ نے کبھی سفارش کی ہے؟“

”نہیں۔۔۔۔۔“

”کیا آپ کبھی سفارش کریں گے؟“

”نہیں۔۔۔۔۔“

بھلا جب سفارش نہ کی گئی اور نہ ہی کرنے کا ارادہ ہے وہاں کام کیسے بنے گا میں نے ان سے پوچھا۔ ”کیا آپ کے دفتر میں جگہ ہے؟“

”نہیں۔۔۔۔۔“

”تو پھر شہاب بھائی عکسی کا کیا ہو گا؟“

”بس آپ فکر نہ کریں۔۔۔۔۔ ضرور کچھ اچھا ہو گا۔“

اس لیے اصرار پر خان صاحب نے مجھے گھور کر دیکھا تو میں چپ ہو گئی۔ تب مجھے معلوم نہ تھا کہ شہاب بھائی اسی طرح مدد کرتے ہیں۔ نہ وہ فائل چلاتے، نہ کسی سے سفارش کرتے، نہ اپنے عہدے کا دباؤ ڈالتے، کسی دوستی رشتے داری کا خواہ بھی نہ دیتے۔ بس وہ کسی اور درگاہ میں کسی اور حضوری میں اپنی کالی صندوقچی میں درخواست بند کر کے لے جاتے وہاں کی منظوری کے بعد دینا خود بخود صادر کرنے پر مجبور ہو جاتی۔ شہاب بھائی جب کسی کے خیر خواہ ہو جاتے کسی پر اپنی نظر کی ردا ڈال دیتے اس کے لئے خیر خواہی کا جذبہ محسوس کرنے لگتے تو پھر ان کی خواہش سے ہی احکامات جاری ہو جاتے، کام بننے لگتے، حالات سدھرنے لگتے۔ وہ چاہے انشاء جی ہوں، خان صاحب کا گھرانہ ہو، مفتی جی کے گھر والے ہوں، شیما مجید کا خچر وجود ہو۔۔۔۔۔ اثار راعی ہو، جمیل الدین عالی ہوں۔۔۔۔۔ بریکیں کھل جائیں، راستے ہموار ہو جاتے، سب کی گاڑیاں اپنے اپنے پٹرول سے چلنے لگتیں۔

شہاب بھائی کی دعا کو روئینگی، پرورش اور برکت سے گہرا تعلق تھا۔ ایک آشریاد ملتے ہی ہولے ہولے نامعلوم طریقے سے نامحسوس انداز میں بانجھ درخت پھل لانے لگتے۔ بیلیں ہری ہو جاتیں۔۔۔۔۔ خشک ان ڈور پلانٹس میں نئے سرے سے پتیاں نکل آتیں، انگوروں کی بیل میں پھل زیادہ آتا، میگوں بیا کے پودے کو پھول بے تحاشا لگتے۔ کبوتروں کے بچے کو اڑا کر نہ لے جاسکتے، لان کے خشک حصوں میں خود بخود سبزہ پھیلنے لگتا۔۔۔۔۔ روئینگی کا بسلسلہ چل نکلتا۔

تو جی کنگہ پڑ جانے پر آپنی آپ نوکری کے پروانے آ جاتے۔ گھر کے لئے بغیر چکر لگائے قرضہ مل جاتا۔ بیٹی کے رشتے کی بات پکی ہو جاتی۔ گودیوں میں بیٹے پوتے آ جاتے۔ ہسپتال سے بھلی خبر آتی۔ اچانک پرائز بونڈ نکل آتا۔ چوری کا سامان چور گھر چھوڑ جاتے۔ کم تنخواہ پر اچھا ملازم مل

جاتا۔ قالینوں پر ہم خیال دوست آکر بیٹھنے لگتے۔ خوشخبری کا سلسلہ پھیل جاتا۔

شہاب بھائی مائل بہ کرم ہوتے تو بیڑوں پر پھل، گلاسوں میں دودھ، چھاپے میں روٹیاں بچتے لگتیں، بجلی کا بل کم آتا، گریڈ اور پنشن زیادہ ہو جاتی، بینکوں میں پیسہ بڑھ جاتا، ٹرانسفر خود بخود درکار جاتی، سرکاری خرچ پر بیرون ملک سفر طے پا جاتا۔ بیٹھے بٹھائے بیوی اچھی لگنے لگتی اور اس کے رشتے داروں پر ترس آنے لگتا۔ بازاروں میں دکاندار کو کا کولامنگا کر اصرار سے پلاتے۔ درزی ہر کپڑا درست ہی کر لانے لگتا۔ یکدم آپ افسر کی مونچھ کابل بن جاتے۔ موٹر سائیکل پہلی کک میں چلنے لگتا۔ جھوٹی بڑی ہر قسم کی گڈلک کا ڈھیر لگ جاتا۔

ان سے خواہشات کے اظہار کی ضرورت نہ تھی۔ وہ جہاں ہوتے وہاں کی ضرورت محسوس کر لیتے اور پھر ایک ایسی جگہ جا کر التجا کرتے جہاں سے وہ کبھی خالی ہاتھ نہ لوٹتے تھے۔ برسوں کی بیماری نکل جاتی۔۔۔۔۔ مقدمہ حق میں ہو جاتا، جانی دشمن ایک روز مصلحتی کا ٹوکرا اٹھائے معافی مانگنے آ جاتا، ہمسائے ہنس ہنس کر سلام کرنے لگتے، بیوی کا عاشق کسی اور کے ساتھ بھاگ جاتا، بچے خود کتیاں لے کر پڑھنے لگتے، بلاوجہ برسوں سے گھبرا یا ہوا دل ہر جگہ خوش رہنے لگتا، خیر ہی خیر ہو جاتی۔۔۔۔۔ آئندہ ملتا۔۔۔۔۔ سر سے لوہے کی ٹوپی، پیروں سے تنگ جوتی، کمر پر کسی ہوئی بلٹ، گردن میں جکڑی ہوئی ٹائی، کلائی کو کھینچنے والی گھڑی کی شین لیس سنیل کی چین، تنگ انگوٹھی، خون نکالنے والے آویزے۔۔۔۔۔ چھینے والی زپ، سب سے پتہ نہیں کیسے چھکارا مل جاتا۔

جب شہاب بھائی کی Wishing سے عکسی کو نوکری ملی تو عکسی نے لاہور میں اول اول نوک اور سنہر بنایا۔ اس کی بلڈنگ ہمارے گھر سے کچھ دور نہ تھی۔ وہ اپنے دفتر کو کیسپس، چڑاسی رزاق کو آفیسر، اور نوکری کو تحفہ سمجھتا تھا لان دونوں میں شہاب صاحب کی اس جہت کو نہ جانتی تھی۔ کیسپس اور آفیسر تک میں نے مان لیا لیکن مجھے یہ یقین نہیں آتا تھا کہ عکسی کو اس کا جواب چاندی کی تھالی پر آپنی آپ بغیر کسی کوشش کے ملا ہو۔

ایک شام ایلیج کے درخت کے پاس عکسی اور میں بیٹھے تھے عکسی کی ایک بری عادت یہ ہے کہ وہ محبت بھری گفتگو کرتا کرتا چانک پھاڑ کے پیچھے جا چھپتا ہے اور کورا انہنی بن جاتا ہے۔ مفتی جی ایک موڈ کے آدمی ہیں۔ عکسی کے ہر موڈ میں کئی اور موڈ چھپے ہوتے ہیں۔ وہ ہستے ہوئے روتا ہے بات کرتے کرتے کہیں اور پہنچ جاتا ہے اور موجودہ کر محسوس نہیں ہوتا۔ تینوں بچے لان میں کھیل رہے تھے۔ بیشک کی طرح عکسی شہاب صاحب کے متعلق کچھ بتانا کچھ چھپانا چاہتا تھا۔

”قدسی تمہیں معلوم نہیں ہے۔“ Shahab is a power

”کیا مطلب۔۔۔۔۔؟“

”ہاں ہو سکتا ہے.....“

”تمہارے بچے چھوٹے اور نازک مزاج ہیں۔“

”وہ تو ہے.....“

”پھر.....“

”زیادہ مت سوچو قدسی اللہ مالک ہے..... اب تو شہاب صاحب اور آگے چلے گئے ہیں اب کام

کیسے خراب ہو سکتے ہیں۔“

عکسی چھٹا پٹی کے فیصلوں کا عادی ہے۔ سفارش نہ کرنے کا بھگتان بھی اس نے اسی وقت

کھڑے پاؤں کیا تھا۔

اسی طرح سن ۷۷ء میں عکسی مفتی نے اپنی پہلی شادی کا بیٹا کرتے ہوئے مجھے انگریزی میں خط لکھا

تھا۔

۷۷ء - ۱۲

۲۰۲ آدم جی روڈ

راولپنڈی

ڈیر ناو!

کل میں نے وٹن برٹن کی بنائی ہوئی بیس پچیس منٹ کے دورانے کی فلم ”فال آف

ڈھاکہ“ دیکھی۔ یہ لمبہ منجمد کرنے کا ایک تجربہ ہے۔ ریزہ ریزہ کرنے والا لاج اور پھر سبھی کہتے ہیں

کہ ہم اس سچ کی تاب لائیں!

میری روح پر ایک خوفناک اندھیرا چھا گیا ہے جو چھٹنے کا نام نہیں لیتا۔ میں اپنا دل بسلانے

کے جتن کرتا ہوں لیکن یہ سکون بے حد وقتی ہوتا ہے۔ ایسے لمحوں میں نہ جانے کتنی بار مجھے

تمہارا وہ خط یاد آتا ہے جو نہ جانے تم نے کس دیوانگی میں لکھا تھا۔

”یہ مکمل تمنائی ہے..... جانے سے کچھ فائدہ نہ ہو گا۔ شادی اس تمنائی کا حل نہیں

ہے۔“

میں نے اس خط کو احتیاط سے رکھ چھوڑا ہے اور کئی بار اسے یاد کرتا ہوں لیکن اس

نصیحت کے باوجود میں نے گھر بٹانے کا فیصلہ کر لیا ہے میں جانتا ہوں کہ شادی بھی میری مدد نہ

کر سکے گی۔ چلو کچھ تو تبدیلی آئے گی اور اس تعفن سے کچھ تو چھٹکارا ہو گا۔

”اس کی ایک magnetic field ہے..... اس فیلڈ میں جو بھی داخل ہوتا ہے اس پر کچھ
دارد راتیں ہونے لگتیں ہیں۔“

”مثلاً.....“

”مثلاً یہ کہ میں اس جو ب کو deserve نہیں کرتا لیکن چونکہ میں شباب کے مقناطیسی دائرے
میں ہوں کوئی مجھ سے یہ نوکری لے نہیں سکتا.....“

”اب تم اس قدر خوش بھی نہ ہو جاؤ عکسی۔ جمعہ جمعہ آٹھ دن کی پیدائش، کچی نوکری اور وہ بھی نیم
سرکاری..... کل بلاسٹ کر دیں تو تمہارا پتہ نہ چلے..... ایویں۔“

”جب تک شباب نہ چاہے مجھے کوئی بلاسٹ نہیں کر سکتا..... جمیل الدین عالی کو دیکھو..... انشاء
جی کو دیکھو..... اپنے خان صاحب کو دیکھو..... ذرا دیکھو..... Watch..... کرو.....

Shahab has wished them well, thats all.

جس روز شباب بھائی کا انتقال ہوا اس روز دوپہر کے وقت مجھے عکسی کی خوبصورت بیوی تمینہ نے
بتایا کہ ”عکسی کے جو ب کا برا حال ہے اس کی جگہ کوئی اور پوسٹ ہو گیا ہے اور وہ وقت دور نہیں جب
عکسی کو یا تو استعفیٰ دینا پڑے گا یا چھٹی کرنی ہو گا۔“ یکدم میرے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی۔ مجھے یوں
لگا جیسے بابا شہاب اپنی برکتوں کے پاؤں بھی سمیٹ کر ساتھ لے گئے ہیں۔ میں نے عکسی سے پوچھا تو کہنے
لگا..... ”ہاں نہیں ٹھیک کتنی ہے حالات مخدوش ہیں۔“

”پھر کوئی سفارش لڑائی؟“

”نہیں۔“

”کوئی سفارش کرو گے؟“

”نہیں.....“

”احق الذی..... انس نای کا سوچو بھلا وہ کیا کریں گے کوئی مشروغہ پکڑو تم تو اسلام آباد میں
رہتے ہو.....“

”ہرگز نہیں.....“

”ہیں کیا کہہ رہے ہو؟“

عکسی نے اپنی بیگنی آنکھیں پونچھیں اور بولا..... ”مجھے یہ نوکری اللہ کی مہربانی سے سلور کی ٹرے میں
ملی تھی..... میں نے اس کے لئے کوئی کوشش، کوئی سفارش نہیں لڑائی جب تک وہ چاہتے ہیں رکھیں گے

جب نہیں چاہیں گے میں چلا جاؤں گا..... لیکن کوشش نہیں کروں گا.....“

”مارے جاؤ گے.....“

سے ہے تو بڑی مصیبت پڑ جاتی ہے۔ دونوں کی طرف داری کرتے کرتے دونوں کا پوائنٹ آف ویو سمجھنے کی کوشش میں دونوں کو سینے سے لگانے کا عزم کرتے کرتے آپ کسی کو بھی قریب نہیں لا سکتے اور عجیب الو کا پٹھا محسوس کرتے ہیں۔

دوسری شادی تو عکسی نے بہت بعد میں کی اور مجھے یقین ہے کسی ماورائی طاقت تلے کی۔ لیکن جب سے شباب بھائی کا وصال ہوا ہے تب ہی سے دل میں میرے عکسی کے لئے بڑا خوف پیدا ہو گیا تھا۔ اس بار جو خلاء اس کے دل میں پیدا ہوا وہ فال آف ڈھاکہ سے کہیں بڑا تھا۔ شباب بھائی کی موت نے ایک ہی بوکے کے ساتھ عکسی کے کنوئیں کا سارا بیٹھا پانی نکال لیا۔ اب اس کے اندر جھانکنے پر کنوئیں کے خالی پن سے خوف آتا تھا۔ اس بار بھی عکسی نے تنہائیوں کا وہی علاج سوچا جو مرد عام طور پر سوچا کرتا ہے۔ مگر بہت کی اوکھلی میں سرخسے کر اتنے دھمکے دھمکے کھانا کہ پھر نہ اپنی ہوش رہے نہ کسی اور کی۔ لیکن اب مجھے لگتا ہے کہ اس بیوہ یتیم پر ترس کھانے والا کوئی نہیں۔ اسے پیارے باتوں میں لگا کر، کندھے پر ہاتھ رکھ کر مارچ دکھانے والا ہاتھ اپنی منزل سیدھی کر گیا۔ اب عکسی سے نہ کسی کی آس لگی ہے نہ ہی عکسی اپنے گھور اندھیرے میں کسی روشنی کی امید رکھتا ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے جاتے جاتے شباب بھائی اسے سلور کی تھالی پر فقیری کی جنم گھٹی پیش کر گئے ہیں اب وہ بڑا افسر تو ہے۔ لیکن نوک ہیرنج کے کنوئیں کی خالی تھالی میں شیشے والی لمبی میز پر سر رکھ کر وہ بھی اشفاق احمد کی طرح سوچتا ہو گا۔

اوکھا گھاٹ فقیری دا بھئی اوکھا گھاٹ فقیری دا

مسلان دے وچ ویلا کڈھنا، مینگن، دے وچ بہنا

اوکھیاں دے نال تھالا لے کے سرسیریں سرکنا

ہمدے ہمدے رہنا

اپنی سیٹ تے عاجزین کے اگے ہو کے بہنا

مرشد موہرے گل نہ کرنی جو آکھے سو سہنا

دنیا داری کم نہیں ایہہ کم اے پتہ چیری دا

اوکھا گھاٹ فقیری دا

عکسی جیسا اعتقاد اور مفتی جی جیسا جذبہ آج تک ہمیں نصیب نہ ہو سکا۔ لیکن اس میں ہمارا بھی کیا دوش؟

سنا ہے جیسا اعتقاد ہوتا ہے ویسی ہی واردات ہونے لگتی ہے۔ کئی برس ہم شباب بھائی کے ساتھ ساتھ رہے لیکن مومی بگلا پانی میں تیرتا رہا اور بھیگا نہیں۔ ہم ان پر وہ دھوسہ نہ کر سکے جو مفتی جی کے گھرانے کی اساس ہے۔ میں مفتی جی کی باتوں کو سنتی، پل بھر کو مانتی پھر بھول جاتی لیکن عکسی کی باتیں چونکہ

انسان ہمیشہ تبدیلی کی خواہش رکھتا ہے۔ اس دنیا میں کچھ بھی ایسا اچھا نہیں جو ہمیشہ رہ سکے۔ تعلیم، ملازمت، بیوی، بچہ، گھر..... ہم ان منزلوں کے سارے زندہ رہتے ہوئے بھی تبدیلی کے خواہاں رہتے ہیں اور بڑھاپے کو جا پکڑتے ہیں۔ جہاں پہنچ کر آخری ایک ہی منزل رہ جاتی ہے..... موت! ساری منزلوں کی واحد منزل..... بلاشبہ یونگ جیسے بڑے نفسیات داں نے اسی لئے کہا تھا..... ”جس طرح ایک سکہ خرچ ہو کر ہی اپنے پورے مول پاتا ہے اسی طرح موت انسانی روح کی صحیح قیمت آ نکلتی ہے“۔ اس طرح یونگ نے ساری انسانی زندگی کی ایک ہی منزل طے کر دی تھی..... موت! میں نے تمہیہ سے درخواست کر دی ہے..... وغیرہ وغیرہ

اس خط کو پڑھ کر میرا ہوشک ہو گیا۔ میں شگون پر اعتقاد رکھتی ہوں۔ گھر سے نکلتے وقت کالی بلی راستہ کاٹے تو باہر جانے کے لئے میرے پاؤں نہیں اٹھتے۔ شادی اور موت کا ذکر ایک ہی صفحے پر دیکھ کر میرے طوطے اڑ گئے اور بائیں آنکھ پھڑکنے لگی۔

اس خط کے بعد پورے سترہ سال بعد جون میں ہمیں عکسی نے اپنی دوسری شادی کے بعد خط لکھا

۸۸-۶-۱۱

عزیز ترین بانو اور اشفاق.....

اس ماہ رمضان میں میری دوسری شادی ہو گئی۔ میں نے ابو کو نہیں بتایا لیکن اللہ کو کچھ اور منظور تھا۔ انہیں معلوم ہو گیا ان کے لئے یہ بات بہت تکلیف دہ ہو گی۔ وہ دوسری شادی کو شدید نفرت سے دیکھتے ہیں کیونکہ وہ خود اس کا شکار رہے ہیں..... ساری زندگی! بہت بہت سال گزرے جب میں بیمار اور تھکتا مجھے تمہارا ایک خط ملا تھا ابھی بھی میرے پاس یہ خط ہے..... میں اس کی کاپی بھیج رہا ہوں۔ پڑھ لو۔ مجھے یقین ہے تمہیں یہ خط یاد نہ ہو گا، تمہیں یہ بھی یاد نہ ہو گا تم نے یہ خط کیوں لکھا۔ جس طرح تمہیں یاد نہیں کہ یہ خط کیوں لکھا گیا۔ ایسے ہی میں نہیں جانتا کہ میں نے دوسری شادی کیوں کی..... مقدر کی عجیب طاقت نے مجھے مجبور کر دیا..... اس طاقت کو نہ میں سمجھتا ہوں نہ ہی اسے کنٹرول کر سکتا ہوں..... وغیرہ وغیرہ

اگر آپ کو میاں بیوی دونوں سے محبت ہو جیسی مجھے اور خان صاحب کو تمہیہ اور عکسی

ساری کی ساری انگریزی میں ہوتی تھیں ان کا اثر بھی مجھ جیسی تھوڑو رلڈ کی عورت پر دوٹا ہوتا لیکن یہ اثر بھی..... وٹ کے ساتھ زائل ہو جاتا۔ شباب صاحب کو پیرایا "اللہ لوک" سائیں بادشاہ سمجھنا میرے بس کا روگ نہ تھا۔ ہم تعلیم یافتہ، نئی روشنی اور مغربی سوچ کے لوگ تھے۔ ہمارے لئے سن ۷۰ء تک شباب بھائی کی ایسی کوئی جہت نہ کھلی کیونکہ خود ہمارے وجود کو اس سوچ کی ضرورت نہ تھی۔ ہم اپنے کس بل میں اتنے مشغول تھے کہ کسی اور کی قوتیں ہمیں اگر متاثر بھی کرتیں تو یہ بالکل کتابی بات ہوتی۔ مفتی جی ہمیں دیکھ دیکھ کر جلتے، بے حال ہوتے۔ وہ ہمیں باتوں کے دیئے جلا کر روشنی کرنا چاہتے تھے۔ نہ خدا ہماری ضرورت تھا، نراس کے بندے ہماری لائن تھے ان دنوں مفتی جی کی خط و کتابت کا یہ رنگ تھا۔

ہانو!

تم دونوں پر اب کوئی امید نہیں رہی۔ تمہارے ذہن بلندیوں پر پرواز کرتے ہیں۔ تمہارے دل تگلے ہوئے ہیں۔ تمہارے اندر دیمک لگی ہوئی ہے۔ تمہارے ایمان اس لئے مضبوط نہیں کہ تمہاری "انا" بہت خود سر ہے۔ تم بیل نہیں بن سکتے جو دوسرے کا سارا لے۔ تم میں امید کا دیا نہیں جلتا۔ اس لئے کہ تم اپنی انا کے اندھیرے میں رہنا پسند کرتے ہو۔ تم کسی دوسرے کو دیپ ماننے کے لئے تیار نہیں۔ میں ایک چھوٹا آدمی ہوں۔ بہت چھوٹی انا، بیل ہوں، سارے لیتا ہوں۔ اتنا غلیظ ہوں کہ پاک صاف کی پاکیزگی مجھے دکھتی ہے، بری لگتی ہے تم دونوں اور میرا کوئی میل نہیں پھر بھی مجھے اس پر فخر ہے کہ میں تم دونوں کے قریب سمجھا جاتا ہوں تمہیں جانتا ہوں..... تمہارا دوست سمجھا جاتا ہوں۔

ممتاز

مفتی جی کا یہ سچا خط ملا۔ ہم پر اثر نہ ہوا کیونکہ ہمارے غبارے میں انا کی گیس ہمیں اوپر ہی اوپر اڑائے لئے جاتی تھی، اتنا اوپر کہ کبھی کبھی خوشی سے دل دھڑکنا بند ہو جاتا۔ مفتی جی نے شباب بھائی کے سلسلے میں جو آخری خط لکھا وہ یہ تھا۔

ہانو!

کتے کا کام ہے بھونکنا۔ کوئی سننے نہ سنے۔ پروا کرے نہ کرے۔ لاہور میں میری دو چیزیں ہیں۔ جو بے حد قیمتی ہیں ایک تم..... دوسرے اشفاق، تمہارے بچے اور وہ سب جو تم دونوں کو عزیز ہے۔

میں دیر سے بھونک رہا ہوں۔ تم عقل کی ترازو میں تولتے ہو تو میری بھونک کو تولتے رہو..... میں بھونکنا بند نہ کروں گا۔
اللہ تم سب کو اپنی حفاظت میں رکھے۔

ممتاز

نہ تو میں مارے ندامت کے اس خط کا جواب دے سکی نہ ہی مفتی جی سے جھوٹ بولنے کی ہمت پڑی۔ وہ نہیں جانتے تھے کہ ان کی طرح اعتقاد کرنے کے لئے ان جیسا خمیر بھی ضروری تھا۔ اللہ تو گھڑی گھڑائی صورتیں بھیجتا ہے۔ مچھلی اڑنے کے خواب تو دیکھ سکتی ہے پراڑے کیسے؟

بہت سال پیچھے کی بات ہے مفتی جی ابھی سیٹلائٹ ٹاؤن میں رہتے تھے اور انہیں ہومیو پیتھی کا چکانہ لگا تھا۔ ہم ان کے پاس ٹھہرے ہوئے تھے۔ میرے بیٹوں بچوں کو موٹر سائیکل پر اسلام آباد کی سیر کرانے کے بعد وہ ان گنت بسکٹوں کے ڈبے اٹھائے آگن میں آئے۔ وہ ہماری محبت سے دمک رہے تھے۔

خان صاحب نے ایک بسکٹ لفافے سے نکال کر کہا "یار مفتی میں بھول نہ جاؤں..... شباب کو ضرور ملنا ہے، بڑا اچھا دوست ہے۔"

مفتی جی سدا حائے ہوئے بھالوسے خونخوار بھیڑیے بن گئے۔

"اوئے تو شباب کو اپنا دوست سمجھتا ہے؟ شباب کسی کا دوست نہیں۔ خان صاحب اس بھرے میں نہ رہنا ہاں جی۔ جہاں شباب ہے وہاں دوستیاں نہیں ہوتیں۔ یہ صوفی لوگ کب دوستیوں کی پروا کرتے ہیں۔ یہ ایک اور مخلوق ہے یہ خود غرض لوگ تو مسلک پر بیٹا قریان کر دیتے ہیں۔" میری نگاہوں میں ثاقب گھوم گیا۔

"کون سا بیٹا مفتی جی؟ خوفزدہ ہو کر میں نے سوال کیا۔

"حضرت ابراہیم نے بیٹا قریان نہیں کیا تھا؟..... یہ شباب اسی قبیل کا ہے۔ یہ کب پروا کرتا ہے بیٹے بیٹیوں کی..... دوست کون ہوتا ہے اس کی ڈکٹری میں یہ لفظ نہیں ہے ہاں۔" میرے لئے قدرت اللہ شباب کا یہ بالکل نیا اور انوکھا تعارف تھا۔ میں شباب بھائی کو ایک ایسا رحم دل انسان سمجھتی تھی جو بیٹے قریان کرنے کے قابل نہ تھا لیکن مفتی جی کی بات چو نکانے والی تھی میرے اعتقادات کو نہیں پہنچی۔ کچھ دیر سب خاموشی سے بسکٹ کھاتے رہے پھر خان صاحب نے بڑے جھنجھو انداز میں خوش کرنے والی مسکراہٹ کے ساتھ اپنے اور شباب کے دیرینہ تعلقات کا ذکر کیا اب تو مفتی جی کے حساب پانی سرے گزر گیا وہ بولے..... "اوئے تم دونوں اندھے ہو..... پیدا کنٹی اندھے..... قدیہ کو اشفاق

کے علاوہ کچھ نظر نہیں آتا اور اشفاق کو اپنے سوائے کچھ دکھائی نہیں پڑتا۔ اوگے اندھو! پانی میں رہتے ہو پر تمہارے بطن جیسے مومی پر کبھی نہیں بھٹکتے۔ تم دونوں اشفاق..... یار شہاب میں رہتے ہو اور بالکل خشک جیسے بریتی..... "اشفاق خان کا داؤد خانی گیہوں جیسا رنگ گلابی ہو گیا۔

مفتی جی شدید ہیں اور انصار کو لازمی سمجھتے ہیں۔ وہ صرف وہاں دوستی پال سکتے ہیں جہاں ہم نظری قائم رہے..... خان صاحب مصر تھے کہ شہاب بھائی ان کے دوست ہیں۔ مفتی جی کے لئے یہ بات سمجھنی، ماننی، قبول کرنی ناممکن تھی اس لئے بڑا دنگا ہوا۔ جب بھڑاس نکل گئی تو مفتی جی اور خان صاحب مل کر شہاب بھائی کو ملنے چلے گئے اور میراپتہ کاٹ دیا۔

مفتی جی نے اسلام آباد منتقل ہونے کے بعد شہاب صاحب کے متعلق ڈائریاں رکھیں، ان کے خط محفوظ کئے، اخباروں میں سے تراشے کاٹے۔ وہ شہاب بھائی کے متعلق اتنا ڈیڑھا جمع کر چکے تھے کہ کبھی کبھی لگتا وہ دن دور نہیں جب وہ شکر پڑیوں کے درختوں پر شہاب شہاب لکھا کریں گے اور اگر کسی نے انہیں رد کا تو وہ روکنے والے کا سر قلم کر دیں گے..... لیکن اتنا سارا انصار بھی حجاب بن گیا اور مجھے اصلی شہاب بھائی نظر نہ آ سکے۔

انصار کا طریقہ جب فیل ہو گیا اور میں ان سے تبادلہ خیال کے باوجود کچھ بھی نہ سمجھ سکی تو میری کھوج نے ایک اور راستہ محسوس کیا۔ یہ طریقہ خاں صاحب کا ہے۔ خاں صاحب دیہات سے آئے ہیں۔ گاؤں میں لوگ آسمان کو دیکھ کر بارش کا اندازہ لگاتے ہیں۔ ہواؤں کا رخ ہی انہیں موسموں کا پتہ دیتا ہے۔ میٹری بولے تو بارش مانگتی ہے۔ کوا کائیں کائیں کرے تو پروہنا آتا ہے۔ کسان کے لئے فطرت کے راز کھیتوں، درختوں، کھلیانوں میں بکھرے پڑے ہیں۔ خاں صاحب کو ہر کسان کی طرح ہمیشہ سے بزرگوں کی بڑھی پر بڑا اعتماد ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ قرن باقرن سے جو عقلمندی اور سو بھ فضا میں اکٹھی ہوتی رہی ہے اگر آج کا انسان اسی سوچ کا فائدہ اٹھائے تو کئی رائیگاں سفر ختم ہو جائیں۔ خاں صاحب کا خیال ہے کہ سائنس چونکہ اپنے پرکھوں کی عقل، نصیحت، انکے خوابوں، تجربوں پر چل کر آگے بڑھتی ہے اسی لئے سائنس کا سفر سیدھی لائن میں ہے اور انسان چونکہ پیچیلی عقل سلیم کے شور سے فائدہ نہیں اٹھاتا اس لئے بنی نوع انسان کے رویوں کی گروتھ دائرے میں ہوتی ہے۔ ہر پود اپنے تجربے خود کرتی ہے۔ پچھلے بابوں کے نچوڑ سے فائدہ نہیں اٹھاتی اس لئے اس کا سفر ہمیشہ دائرے میں رہتا ہے۔ کبھی یہ دائرہ آتش بازی کے دائرے کی طرح اوپر چڑھتا ہے کبھی میڑھیوں کے سپارل کی طرح اٹھتا ہے لیکن بنی نوع انسان کی ذات کا ارتقا سیدھی لائن میں نہیں ہو پاتا اسی لئے ہر پڑھی عموماً ریس کے شارٹنگ پوائنٹ سے ہی سفر شروع کرتی ہے۔ ساٹھ ستر سال کا سفر ختم کر کے جب منزل پر پہنچتی ہے تو دوسری پود منزل سے شارٹ نہیں لیتی بلکہ پھر شارٹنگ پوائنٹ پر پہنچ جاتی ہے اسی طرح انسان کبھی ارتقا کی



اشفاق احمد

دوسوں کی طرح ہوں۔ میرا جی چاہتا ہے تمام پیتل کے برتن مانجھے جائیں، دریاں کھیں جھاڑ کر بچائے جائیں، ہارپان ہوں، ڈھول تاشے بجیں۔ کہیں سے ایک سرخ قالین کا ٹکڑا بھی آئے جو مہمان کے لئے بچھایا جائے۔ کوئی مینڈھا زنج ہو۔ کوئی دیگ چڑھے۔ یہ ساری شو آف قسم کی میزبانی شاید میں نے سکول سے سیکھی تھی جہاں انسپکٹر آف سکولز کی آمد پر چھڑکاؤ ہوتے، کیلے کے پتوں کے پھانک بننے، سفیدیاں ہوتیں، مینچ انسپکٹر آف سکولز کے راستے میں پھول کی پتیاں بچھاتے اور زور زور سے ہینڈ بجاتا۔

”فوری ازاے جولی گڈ فیلو... فور ہی ازاے جولی گڈ فیلو.....“

میرے چہرے پر مہمان کی خبر لگتے ہی جو خوشی پھیلی ہوگی اسے دیکھ کر خان سٹپٹا گئے۔ ”دیکھو قدسیہ کچھ بڑھا چڑھا کے نہ کرنا..... شہاب ایسی باتوں سے گھبرا جاتا ہے ہم باورچی خانے میں کھانا کھائیں گے۔ تم پوریاں کچھ اچھی بنالیتی ہو بس وہی ٹھیک ہیں۔ آلو کی پوریاں بننے وغیرہ..... زیادہ کچھ نہ کرنا.....“

اس گھر کے شروع میں برآمدہ اور آخر میں باورچی خانہ تھا۔ اور اصل میں یہی دو جگہیں زیادہ آباد رہتی تھیں۔

”لیکن باورچی خانے میں کیوں خان صاحب.....؟ ہمارے پاس تو ٹوٹل چار ڈگڈگی موڑھے ہیں۔ ایک چھوٹی تپائی ہے تیل کا چولہا ہے..... یہاں وہ کیسے کھانا کھائیں گے؟“

”جیسے کھاتے ہیں ویسے کھالیں گے.....“

خان صاحب میں ایک بڑی زیادتی ہے۔ وہ کسی کی خاطر نہ اپنی زندگی کا پیرزن نہ اپنے معمولات نہ ہی اپنے مزاج کا زویہ بدلتے ہیں۔ وہ جس طرح بیٹھے ہوں گے ویسے ہی مہمان سے ملنے چلے جائیں گے بلکہ اسے اپنے پاس بلا لیں گے۔ جو کھا رہے ہوں گے اسی چٹنی روٹی میں مہمان کو شامل کر لیں گے۔ جیسا موڈ ہو گلاس کے مطابق عمل کریں گے۔ ان کے پاس کھانے اور دکھانے کے لئے ایک ہی سیٹ وائنٹوں کا ہے۔ دفتر، غسل خانے، بازار، ریڈیو سٹیشن، ٹیلی ویژن، سنوڈیو میں اشفاق احمد گرگٹ کی طرح رنگ نہیں بدلتے بلکہ ہر مقام اور جگہ پر ان کا صرف رول بدلتا ہے وہ خود وہی رہتے ہیں اگر وہ کسی ادبی محفل میں پاکستان یا اسلام کی خیر خواہی میں کسی سے الجھ جائیں تو میں لاکھ ہاتھ باندھوں وہ اپنا نظریہ بیان کر کے رہیں گے۔ اگر وہ کتابوں والی الماری کی جانب چہرہ کر کے کتاب پڑھنے میں مصروف ہیں اور کوئی مہمان آ جاتا ہے تو وہ ہنگام ہنگام نہ اپنی نیکر جیکٹ بدلیں گے نہ ہی اپنا انداز نشست۔ بس اسی انداز میں بیٹھے بیٹھے کبھی گفتگو کے ساتھ، کبھی مکمل خاموشی سمیت مہمان کے پالا گن رہیں گے..... دراصل اس انداز سے خان صاحب کی مراد یہی ہوتی ہے کہ مہمان مکمل طور پر اپنے آپ کو گھر کا فرد سمجھیں۔ بیٹھنا چاہے تو بیٹھے، باورچی خانے میں کچھ کھانا پینا چاہے تو زہے نصیب..... وی سی آر یا ٹیلی ویژن لگا کر چھوٹے خانوں سے

طرف نہیں چل سکتا، انروں میں گھومنا ہوتا ہے۔

خان صاحب سو گھگھ کر، محسوس کر کے، دیکھے بغیر جو اندازہ لگاتے ہیں۔ اس کا اظہار کبھی نہیں کرتے۔ انہوں نے شہاب بھائی کو کبھی ابو الفضل، ابو الکلام، ابو الحسن نہ پکارا، وہ انہیں قطب، ’دلی‘ ابدال ثابت نہیں کرنا چاہتے۔ وہ تو ہمیشہ بے تکلفی سے شہاب بھائی کو اپنا سب سے پیارا دوست ہی سمجھتے رہے۔ لیکن ایک چھوٹی سی سبڑاڑی ایسی بھی ہمارے گھر میں موجود ہے جس پر شہاب بھائی کے ہاتھوں کی لکھی ہوئی آیتیں، وظیفے، ورد و رقم ہیں۔ کیا خان صاحب ان وظیفوں پر عمل کرتے ہیں؟ کیا شہاب بھائی ان کی تعلیم فرماتے رہے ہیں؟ کیا خان صاحب جو بڑے گریہ سستی، منتظم اور کثیر المقاصد شخص ہیں، ایسی اندرونی زندگی کو باقاعدگی سے اپنا سکتے ہیں؟ اس چیدستان کی طرف کوئی اشارہ مکمل طور پر نہیں ملتا کیونکہ کسان فطرت کی باتیں سمجھنا ضرور ہے ان کا برملا ذکر کسی سے نہیں کرتا۔

ابھی ہم سمن آباد میں تھے جب مجھے خان صاحب کے طریق پر عمل کر کے احساس ہو گیا کہ بظاہر وہ بہت معمولی روش اختیار کر کے، معمول زندگی کو عام سطح پر رکھ کر، ہنسی مذاق کا پردہ ڈال کر چلنے والے ہیں شہاب بھائی ہر گز ہر گز عام روش کے آدمی نہیں ہیں۔ ان کے عمل کا طریقہ گو میری سمجھ میں نہیں آیا لیکن وہ تمہ در تمہ زندگی بسر کرتے ہیں۔ مجھے اس بات کی سمجھ بالکل ویسے ہی آئی جیسے ہواؤں میں منہ اٹھا کر کسان کہتا ہے..... ”آج سہ پہر کے وقت بارش آئے گی..... کوئے گلدھ اونچے اونچے اڑ رہے ہیں.....“

سمن آباد میں ہمارا گھر نیو بویل والی گراؤنڈ کے سامنے نکڑ پر تھا۔ اس گھر کی دو منزلہ عمارت اور کاٹھی بڑی مضبوط تھی۔ چھوٹے سے بیرونی برآمدے میں ایک پر تنگ مشین پڑی رہتی تھی۔ جس پر ہم کبھی چادر، کبھی ترپال اور کبھی گتے کی شیٹ ڈال کر اس کی حفاظت کا انتظام کیا کرتے تھے۔ پھانک کے ساتھ ساتھ وہ تین فٹ اونچی دیوار تھی جس پر میرے بیٹے انیق خان اور انیس خان دونوں بازو پھیلا کر چلنے کی پریکٹس کیا کرتے تھے جیسے سرکس میں لیڈی تار پر چھتری لے کر چلتی ہے اور اشیر خان یڑھی پر بیٹھ کر ان کا واحد تماشا ہی ہوا کرتا تھا۔ اگر اشفاق خان گھر پر نہ ہوتے تو شہاب بھائی اس برآمدے سے آگے نہ بڑھتے۔ یہیں پر تنگ مشین کے پاس کھڑے ہو کر کچھ ندامت، کچھ لجاجت اور کچھ اوپرے پن سے میری خیریت پوچھتے..... بچوں کا سرکس دیکھتے۔ اشیر خان کی گال چھو کر، شرمائے سے، اس کا حال پوچھتے اور چلے جاتے..... خان صاحب کے سوائے اس گھر میں ان کا کوئی واقعہ نہ تھا۔

اسی واقعیت کو بڑھانے کے لئے ایک روز مجھے خان صاحب نے کہا ”بھئی کل شام شہاب اور عفت کھانے پر آ رہے ہیں تم کوئی انتظام وغیرہ کر لینا“۔

مجھے مہمانوں کی خوشی بہت چڑھ جاتی ہے۔ میں اس معاملے میں ریگستان میں رہنے والے بدو

سب شپ کی خواہش ہو تو اور بھی اچھا۔ کوشے پر چڑھ کر کبوتروں کو دانہ دنگاؤں گرا رضی ہوتا ہو تو کسی قسم کی ممانعت نہیں۔ باہر زاویے میں بیٹھ کر کسی سے لمبے لمبے فون کر کے خوش رہے تو کسی کو اعتراض نہ ہو گا۔ ایسی فضا میں آزاد منش لوگ ان سے بہت زیادہ مل جاتے ہیں لیکن فارمل لوگ جنہیں ذرا تنگ روم، نمائش کی گھنگھو، جی سجاٹی ٹرولیاں، ٹشو پیپر، کواٹر پلٹش، گھٹنے سے گھٹنا جوڑ کر بیٹھنے کی عادت ہو ان سے زیادہ دیر راضی نہیں رہتے۔

شباب بھائی کو غالباً خان صاحب کی بچی ادالپند تھی۔ خود آزاد رہنا اور دوسرے کو آزاد رکھنا۔ اسی لئے وہ خان صاحب سے زیادہ خوش نظر آتے تھے۔

سمن آباد کے چھوٹے سے آٹھ بائی چھ کے باورچی خانے میں اس شام ایک بڑی یادگار دعوت ہوئی۔ چھوٹی سی چچی تائی نما میر پرویشو کھانا چنا گیا۔ جس وقت شباب بھائی اور عفت آئے وہ نیچے گول موڑھوں پر بڑی بے تکلفی سے بیٹھ گئے حالانکہ اس وقت عفت نے سفید ساڑھی اور ہنڈولے کی شکل کے آویزے پہن رکھے تھے اور شباب بھائی پر تکلف نیلے سوٹ میں ملبوس تھے۔ وہ یا تو کسی فارمل پارٹی سے آ رہے تھے یا ان کو اس دعوت کے بعد گورنر ہاؤس وغیرہ جانا تھا۔ شباب بھائی نے بغیر تعریف کئے کھانا اس رغبت اور محبت سے کھا یا کہ ہمیں احساس بھی نہ رہا کہ اس سے زیادہ کچھ کرنا ممکن بھی تھا۔ اسی یادگار دعوت شیراز کے دوران شباب بھائی نے ان ادیبوں کی فرست تیار کی جن کو گلڈ کی طرف سے مشرقی پاکستان جانا تھا۔ جتنی دیر یہ لسٹ تیار ہوتی رہی اعجاز بٹالوی اور جمیلہ ہاشمی کا نام بار بار آیا۔ میں اس وقت صاحب کتاب تھی لیکن ان دونوں کے چروں پر میری ادبی کی کوئی پہچان نہ تھی۔ بار بار میرا جی چاہا کہ کون شباب بھائی آپ مجھے مشرقی پاکستان بے شک نہ بھیجیں لیکن پلیز اتنا تو مانیں کہ میں ادیبوں کی فرست میں شامل ہونے کے قابل ہوں۔

ایسی ہی خفت میں نے ایک دفعہ پہلے بھی برداشت کی تھی۔ میرا مٹھلا بیٹا انیس خان بیمار تھا اور میں اسے گودی میں اٹھا کر سمن آباد کے ایک ڈاکٹر کے پاس لے گئی تھی۔ انیس ابھی تھوڑا تھوڑا صاف بولنے لگا تھا۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ ڈاکٹر صاحب کی فیس کتنی ہوگی۔ میرے پاس جو چند روپے کے نوٹ تھے انہیں میں نے بل دے کر مٹھی میں قابو کر رکھا تھا۔ ڈاکٹر صاحب بڑی بند بند شخصیت کے آدمی تھے۔ ان کے کلینک میں کوئی مریض نہ تھا۔ پھر بھی وہ فارن کوالفائڈ ڈاکٹروں کی طرح ذہنی طور پر Pre-occupied نظر آنے کی کوشش کر رہے تھے۔ میں کرسی میں آگے ہو کر بیٹھی تھی۔ انیس خان کی بند ٹاک سے سیٹیج کی آواز بار بار آتی تھی۔ ڈاکٹر صاحب نہ مریض کی حالت پوچھنے کے موڈ میں تھے نہ ہی بولتے تھے۔ میں نے انہیں ملائم کرنے کے انداز میں کہا۔

”جی میں اشفاق احمد کی بیوی ہوں.....“

ان کے چہرے پر اس نام سے کوئی چمک نہ آئی۔ بلکہ ایک ابرو قدرے اور اونچا اٹھ گیا۔
”ممتاز مفتی اور شباب صاحب کا نام تو آپ نے سنا ہو گا..... قدرت اللہ شباب! وہ میرے شوہر کے بڑے دوست ہیں۔“

ڈاکٹر صاحب نے مربیانہ انداز میں مسکرانے کی ہلکی سی کوشش کی لیکن ان دونوں ناموں کا ان پر کوئی اثر نہ ہوا۔ ”میں بھی کھیتی ہوں..... ریڈیو ڈرامے..... کمانیاں ناول.....“

ان کے چہرے پر ”اول ہوں“ ایسی کیفیت طاری ہوئی کہ مجھے درمیان میں جملہ ادھر اچھوڑنا پڑا۔

”منہ کھولو..... اور..... اور.....“ میری باتوں کی پروانہ کرتے ہوئے انہوں نے انیس خان سے کہا۔ ماں کی باتوں کے جھوٹ کی تصدیق وہ بیٹے کا دہن کھلوا کر کرنا چاہتے تھے۔

انیس نے منہ کھولا.....

”اور.....“

چھوٹا سادہ بن اور کھلا

”اور.....“

انیس کا رنگ بدلا اور منہ اتنا ہی کھلا رہا۔

”کیا نام ہے تمہارا.....“

انیس نے توتلی زبان میں مضار مضار کر ایک لمبی سی غلیظ گالی دی۔

ڈاکٹر صاحب جو Snob تھے پورے جھنجھوڑے گئے۔

”کیا.....؟“

”لالہ.....“ اور اس کے آگے پھر چند توتلی..... ماں بسن کی شان میں مغلطات۔

”بیٹے میں آپ کا نام پوچھ رہا ہوں“

انیس نے یہ گالیاں اپنے ناموں پر دوز، تاپا، افتخار اور ملازم زمان سے سیکھی تھیں۔ اس نے نیا نیا بولنا سیکھا تھا اور کھانے والے سمجھتے تھے کہ بچے کی زبان سے اول اول یہی کچھ نکلتا اچھا لگتا ہے۔ اس کے ساتھ اگر ملل کا کریم، موتے کا بار، تھوڑا سا پان بھی بچہ کھالے تو سبحان اللہ۔ میں نے ہاتھ میں رول کئے ہوئے روپے میز پر رکھے، دنگ ڈاکٹر صاحب نسخہ لکھنا بھول گئے۔ شاید انہیں یقین آ گیا تھا کہ میں ادیبہ ہوں اور اس انوکھی نوع کے لوگوں کے ہاں ایسے ہی بچے پیدا ہوتے ہیں۔ بالکل ایسی خفت میں نے تب محسوس کی جب گلڈ کی جانب سے ادیبوں کا وفد مشرقی پاکستان چلا گیا اور میری ادبی نے کوئی گل نہ کھلائے۔ کئی دن میں اندر ہی اندر اس بے انصافی پر کڑھتی رہی۔ سندر بن کے ہاتھی، جو ہڑوں میں اگے شپیل کے

پھول، بازاروں میں بکتے ناریل، لمبی زلفوں سیاہ آنکھوں والی بچائیں..... یہ بند خواب میں کھلی آنکھوں اتنی مرتبہ دیکھنے لگی کہ مجھے یاد ہی نہ رہا اشفاق احمد کو ڈھاکہ گئے کافی دن ہو گئے ہیں۔
پھر شہاب بھائی مجھے ملنے آئے، وہ پرنٹنگ مشین سے آگے نہ بڑھے۔ مہارانی سیتا کی بس یہی حد تھی۔

”آپ کے خان صاحب کا تو ڈھاکہ میں بہت دل لگ گیا ہے، وہ تو شاید کرشن چوڑا کے درختوں کو چھوڑ کر نہ آسکیں۔“

میرا دل دھک سے رہ گیا۔ میری مزاح کی حس ویسے بھی کمزور ہے۔

”کرشن چوڑا کیا شہاب بھائی؟“

”بہت بڑا چھتار اور خست ہوتا ہے۔ اس پر کیسری، نارنجی پھول لگتے ہیں کچھوں کی شکل میں..... اشفاق کو ان درختوں سے محبت ہو گئی ہے۔“

جوانی میں شوہر کو اگر اپنی ذات سے پرے اخبار بھی اچھا لگے تو اخبار بھی برا لگتا ہے۔

”انجاز بناؤ اور اشفاق صبح ناشتے کے وقت پورا پورا انٹر کیلوں کا کھا جاتے ہیں۔ وہاں کا کیلا اتنا بڑا اور بے حد میٹھا ہوتا ہے.....“ شہاب بھائی نے کہنی تک اشارہ کیا۔ ایسے کیلے تو میں نے دیکھے نہ سنے..... پھر پورا انٹر کیلوں کا خریدنا بھی نڈل کلاس کی عورت کے لئے اچھبے کی بات تھی۔

”دوہرے کھانے کے ساتھ ذاب پیتے ہیں۔ دودو ذاب ہی کس!“

”ذاب کیا شہاب بھائی؟“

”کچا ناریل..... بالکل کچا اس کے اندر ابھی اس کی گرمی دودھیا ہوتی ہے اسے درمیان میں سے کاٹتے ہیں پھر درانتی نما چھری سے ذرا سا کرید دیتے ہیں۔ ناریل سارے کا سارا لطیف پانی میں بدل جاتا ہے۔ بیٹھا دودھیار“

”اچھا ہی؟ بڑا مزیدار ہوتا ہو گا ناریل کا دودھ“

”بہت..... آپ تو وہاں گئی نہیں ورنہ آپ بہت انجوائے کرتیں۔“

میں نے نگاہیں جھکا لیں..... اب میں ان سے کیا کہتی کہ میں ڈھاکہ کیوں نہ گئی؟۔ ”شام کے وقت کھل کھل کھلا اور میٹھا دی..... ہلکا براؤن دی..... عجیب مٹھاس ہوتی ہے۔ اس میں“

نہ میں نے کبھی کھل کھلا کھایا تھا نہ براؤن میٹھے دی سے میری واقفیت تھی۔

”منیر چوہدری رات کو سب مندوین گھیر گھا کر کالے داس کی دکان پر لے جاتا ہے، روٹے بھر بھر کر سونڈیش کھاتے ہیں سب ہر رات؟“

”سونڈیش..... وہ کیا ہوتی ہے؟“

”میٹھے پیر کی مٹھائی ہے بڑی لذیذ..... بس اب آپ اپنے دل کو مضبوط کریں۔ اشفاق تو غالباً مل ملا کر وہیں کاروں کی انجنی لے لے گا..... شام کو کبھی جھربنا کاناچ دیکھتا ہے کبھی کا بل کا..... کبھی لٹلی اور جند بانو کے گیت سنتا ہے کبھی فردوسی بیگم کی فارسی غزلیں..... لگتا ہے اب وہ چاٹ گام میں رہے گا کسی سانولی بنگال کے ساتھ“۔ یکدم میرا چہرہ دیکھ کر شہاب بھائی بالکل چپ ہو گئے۔

عام طور پر انسان ان چیزوں کے ذکر سے بہت گھبراتا ہے جن کے متعلق اس کی معلومات کم ہوتی ہیں۔ ایسی اشیاء جو آپ نے استعمال نہ کی ہوں۔ کسی ایسے علاقے کا ذکر جہاں آپ کو جانے کا اتفاق نہ ہوا ہو۔ نئے رسم و رواج..... آج کا عہد دراصل انفرمیشن کا عہد ہے جس کے پاس جتنی زیادہ انفرمیشن ہو اور وہ اسے بکھارنے کا فن جانتا ہو اتنا ہی وہ معتبر اور روزنی لگتا ہے۔ میں تب کے مشرقی پاکستان کی انجنی انفرمیشن سن کر یکدم سپٹا گئی اور شہاب بھائی کو معاً احساس ہوا کہ وہ مذاق کو بہت دور لے گئے ہیں اسی وقت غالباً انہوں نے دل میں میری تلافی کرنے کا فیصلہ کر لیا ہو گا لیکن مجھ پر اپنے خیالات واضح کئے بغیر انہوں نے اجازت لی اور عفت کو ساتھ لانے کا وعدہ کر کے چلے گئے۔

۶۸ء میں انہوں نے عجیب طور پر اس واقعہ کی تلافی کی۔

ان دنوں ہم سمن آباد چھوڑ کر ماڈل ٹاؤن آئے تھے۔ گھر کے ارد گرد جیک دی مین شاگ کی کمانی جیسے درخت لگے تھے۔ شام کے وقت ماڈل ٹاؤن کی سڑکیں بالکل ویران ہو جاتی تھیں۔ ان ویران سڑکوں پر ریاض محمود اپنے سکوتر پر اور افضال چٹا اور عارف ایک دوسرے سکوتر پر ہم سے ملنے آیا کرتے تھے۔ ان دنوں ایکٹر برادری اپنی ناداری، غفلت، کسمپرسی کی جھبری پوسٹین اتار کر بیورو کریٹ برادری کی طرح پائپ منہ میں لے کر پوہ پوہ چلنا چاہتی تھی۔ شوہر کے لوگوں کو غم تھا کہ بیس سال سے وہ معاشرے کو انٹرنین کر رہے ہیں لیکن اس کی خوشحالی، طاقت اور عزت کے کھاتے میں سے کچھ بھی ان کے نام نہیں نکلتا۔ ان دنوں افضال چٹا ابھی قد آور ایکٹر نہیں بنا تھا اس لئے اس کے پاس وارداتوں، سکیموں، تقریروں، خوابوں کے لئے بڑا وقت تھا۔ وہ ہمیں بھی خوب خوب Involved رکھتا۔ الحمرائے چھوٹے اندرونی ہال میں ایکٹر اور ایکٹر سوں کے جلسے ہوتے۔ بڑی گھما گمی، جوش و خروش رہتا۔ ان سارے جلسوں کا آنکھوں دیکھا حال افضال چٹا شام کو ہمیں سنا۔ دراصل یہ ان ہی دنوں کی آرزوؤں کا نتیجہ ہے کہ آج ایکٹر برادری معاشرے کی مونچھ کا بال بنی ہوئی ہے اور ان کی تصویریں چھاپ چھاپ کر سارے اخباروں کا پیٹ نہیں بھرتا۔

ایک شام افضال دوڑا دوڑا آیا اس کا بغل بچہ عارف جاوید گم سم مسکراہٹوں کے ساتھ کبھی افضال کے دہمیں کبھی بائیں جوکر شوٹ لیتا تھا۔ لیکن پچھرا افضال ہر دو تہی میں اس کی طبیعت صاف کر دیتا۔ ”آپاں! کل قدرت اللہ شہاب فیصلہ کرنے آ رہے ہیں..... تمام ایکٹروں کی منڈلی ان سے ملے

کی۔ تمام مسائل پیش کئے جائیں۔ پھر ایک کمیٹی تشکیل دی جائے گی۔“
 ”آپ نے ان کا مضمون civillines: Culture پڑھا ہے آپ اپنی“۔ عارف نے پوچھا۔

”اویس یہ مضمون سچ میں کیسے آگیا؟ کچھ سوچ کر بولا کہ اس کے بعد افضال نے انتہو کی وہ تقریر پورے اشعاروں کے ساتھ پڑھنی شروع کر دی، جو کھیل جو یس سیز کی جان ہے۔ ایک لمحے کے لئے بھی افضال کو خیال نہ آیا کہ قدرت اللہ شہاب کے ساتھ انتہو کی تقریر سچ میں نہیں آسکتی لیکن تب افضال کی عادت تھی کہ بات کرتے کرتے یکدم وہ کسی ڈرامے کا حصہ ایکٹ کرنے لگتا۔ کسی کردار میں اپنی صفت کاری سے جان ڈالنے لگتا۔ کچھ دیر کے بعد جب گھنٹے ٹیک بازو پھیلا، سر آسمان کی طرف اٹھا اٹھا کر وہ فرینڈز، روزنایز، کنٹری میں کی تقریر کر چکا تو پھر قدرت اللہ شہاب کی طرف رجوع کر گیا۔

”آپاں قدرت اللہ شہاب کچھ کڑو ہیں۔ اگر کسی کی رسائی ان تک ہو تو آرٹسٹوں کے لئے وظیفے، نوکریاں، بیرونی ممالک کے سفر، بہت کچھ ہو سکتا ہے۔ مشکل یہ ہے کہ اتنے بڑے آدمی کو ہم میں سے کوئی نہیں جانتا۔“

اس وقت تک مجھے بھی یقین نہ تھا کہ میں ان کو جانتی ہوں اس لئے میں بھی چپ رہی۔

دوسری صبح کچھ ایکٹر شہاب بھائی سے ملے اپنی تمام تصوراتی اور حقیقی تکلیفیں انہیں سنائیں۔ شہاب بھائی پوری توجہ سے سنتے رہے اور کچھ نہ کچھ کرنے کا وعدہ کر کے اسلام آباد چلے گئے۔ کچھ عرصہ بعد مجھے خط ملا، جس میں ایک سرکاری میٹنگ کا دعوت نامہ تھا۔ خان صاحب اور میں جب اسلام آباد شہاب بھائی کے گھر پہنچے تو اس وقت مسعود کھدر پوش اور اشفاق علی خان ان کے ”ایل شپ“ برآمدے میں بیٹھے ہوئے ناشتہ کر رہے تھے۔ شہاب بھائی نے مجھے صرف اس قدر بریف کیا کہ ایکٹروں کے مسائل اور کلچر کی موجودہ صورت کا جائزہ لینے کے لئے کل ایک کمیٹی تشکیل دی جائے گی فیض صاحب اس کے صدر ہوں گے، آپ بھی اس میٹنگ میں مدعو ہیں۔“

تلافی کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔

دوسری صبح جب شہاب بھائی دفتر جانے لگے تو انہوں نے اپنے پیالے کے ڈرامیور سے بڑی آہستہ آواز میں کہا۔ ”دس بجے تم بی بی کو لے کر ایجوکیشن والے بلاک میں آ جانا اور گاڑی پر جھنڈا لگائے رکھنا۔“

تلافی کے ساتھ اعزاز بھی شائع تھا۔

مجھے معلوم ہے کہ شہاب بھائی اپنی سیاہ مرشدیز کے سامنے صرف اس وقت جھنڈا لہرائے دیتے تھے جب وہ اس میں سوار ہوتے حتیٰ کہ کئی بار ثابت بھی ضد کرنا کہ میں جھنڈا اکھول کر چائیں گا تو وہ جھڑکے بغیر بات رد کر دیتے۔ اس روز ان کی مہربانی واضح تھی۔ وہ ایک پرائیویٹ سوسائٹی میں سود چکانا چاہتے تھے۔ جس وقت میٹنگ روم میں پہنچی میرے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔ کمرے میں بڑی معتبر شکل و صورت کے لوگ موجود تھے۔ میرے لئے کرسی پیچھے کھینچ کر تنویر احمد خان نے کان میں کہا۔ ”شہاب صاحب کا حکم ہے کہ آپ کو میں خود گم آفٹر کروں۔“

میں ششدر رو جیراں تھی۔

پیاز آلو چھلنی چھلنی یکدم میں ٹھنڈے کمرے میں لیڈر کی کرسی سے پشت لگائے بیٹھی تھی اور سچ بچ کے فیض صاحب مجھ سے تین کرسیاں چھوڑ بائیں آنکھ بند کر کے سگریٹ کا دھواں چھوڑ رہے تھے۔ کوئی آدھا گھنٹہ بائیں ہوتی رہیں۔ لیکن کرسی صدارت خالی رہی پھر نظریں جھکائے عاجزی کے ساتھ شہاب بھائی کرسی صدارت پر آکر بیٹھ گئے۔ ”مفتی صاحب کسی ضروری کام کے سلسلے میں چلے گئے ہیں۔ اس لئے اس نشست کی ذمہ داری مجھ پر ہے۔ آپ لوگوں سے استدعا ہے کہ آرٹ اور کلچر کے ضمن میں اور آرٹسٹوں کی موجودہ حالت سنوارنے کے لئے جو بھی مشورے آپ کے پاس ہوں بلا تکلف دیں۔“

میر پر گیند کو ٹھوکر لگا کر انہوں نے کھلا چھوڑ دیا۔ اب گیند سارے میں لڑھکتا پھر تھا۔ کبھی جمیل الدین عالی کے پاس، کبھی فیض صاحب کے آگے۔ کبھی قمر الحسن کی سمت میں۔ پہلے جملے کے بعد شہاب بھائی نے کوئی بات نہیں کی۔ وہ اپنی بھانجی گڈی سے کہا کرتے تھے۔ اگر چپ رہنے سے گزارہ چل سکے تو خاموشی پہلا Option ہونا چاہئے۔

تمہارے پاس ہمیشہ دو چوائس ہوتے ہیں۔ بولنا اور چپ رہنا۔ دوسری چوائس پہلی سے بہتر ہے۔

اس میٹنگ کے دوران کئی مسائل زیر بحث آئے پھر

Standing Committee Art & Culture

تشکیل پائی۔ فیض صاحب اس کے صدر تھے۔ صلاح الدین، قمر الحسن اور ایک خاتون سرزکیر جو اس وقت نہ تو میٹنگ میں موجود تھیں نہ بعد میں کبھی نظر آئیں، مشرقی پاکستان کے نمائندے منتخب ہوئے۔ جمیل الدین عالی صاحب مغربی پاکستان کی جانب سے سلیکٹ ہوئے۔ اس کے بعد میں نے ایک عجیب واقعہ دیکھا۔ اپنے بھانویں کمیٹی مکمل ہو چکی تھی لیکن شہاب بھائی اپنی مدہم آواز میں بولے۔ ”میں بانو قدسیہ کا نام پروپوز کرتا ہوں۔“

پہ نہیں کس گوشے سے غور احمد خان کی آواز آئی..... آئی سینڈوی موٹن.....“

مجھے یہ بھی نہ چلا کہ میں کس طرح میٹنگ میں منتخب ہوئی۔ شاب صاحب اٹھ کر باہر چلے گئے۔ میں نے ڈرتے ڈرتے فیض صاحب سے پوچھا..... ”لیکن میں سمجھی نہیں ہم لوگ کریں گے کیا؟“
بھی تم جاہل لگتی ہو..... کرنا کیا ہے؟ ہم لوگ پشاور، لاہور، کراچی، ڈھاکہ، حیدر آباد وغیرہ کا دورہ کریں گے۔ وہاں کے ایکٹروں سے ملیں گے..... کونسلیں دیکھیں گے۔ بعد میں رپورٹ کر دیں گے حکومت کو.....“

فیض صاحب کے جواب نے مجھے اور بھی مگڑبوا دیا جب میں کار میں شاب صاحب کے ساتھ واپس آرہی تھی تو میں نے ان سے پوچھا..... ”شاب بھائی لیکن سینڈنگ کمیٹی آخر کیا کرے گی؟ اس کے objectives کیا ہیں؟“

وہ مدہم سا مسکرائے اور آئینہ یاد کے انداز میں ذرا سا ہاتھ اٹھا کر بولے..... ”آپ کو ڈھاکہ دیکھنے کا شوق ہے ناں بس وہ دیکھ آئیے فی الحال آپ کا یہی objective ہے..... باقی تمام کام فیض صاحب کر لیں گے۔“

شاب بھائی اور خان صاحب میں ایک قدر مشترک تھی۔ وہ دونوں اپنے اپنے رنگ کے گونگے آدمی رہے ہیں اور شاید اسی لئے انہیں ایک دوسرے کی صحبت میں راحت ملتی تھی۔ شاب بھائی کا گو لگا پن تکلیف دہ نہیں تھا۔ یوں نہیں لگتا جیسے وہ آپ کو کمتر سمجھ کر آپ سے کچھ چھپا رہے ہیں یا وہ اپنی ذاتی زندگی کو صیغہ راز میں رکھنا چاہتے ہیں بلکہ وہ ایک سوئے ہوئے معصوم بچے کی طرح بڑی بے ضرر خاموشی سے وقت بسر کرتے تھے۔ اپنے ہر فیمن کا جواب پکلی مرتبہ ضرور دیتے۔ عورتوں سے ان کے بچوں کا حال پوچھتے۔ مردوں سے ان کی روزی، ترقی گریڈ، بالافسر، زیر دست ملازم کے حالات دریافت کرتے۔ نصیحت آمیز گفتگو سے کبھی بات چیت کو بوجھل نہ کرتے۔ جب نو جوان ان سے بولتے تو بڑی دلچسپی سے ان کی باتیں سنتے رہتے..... ہر مکالمے میں خاموشی، رواداری اور کم سے کم گفتگو سے شمولیت کرتے۔

خان صاحب کی خاموشی تضاد سے جنم لیتی ہے۔ وہ طبعاً خاموش ہیں، لیکن مروت کے طور پر، دوسرے کا دل لگانے کی خاطر اپنا آپ چھپانے کے ضمن میں بولتے ہیں ان کی گفتگو ایک پردہ ہے، حجاب ہے۔ وہ اسی گفتگو کے سارے دوسروں کو اپنے بہت قریب آنے سے روک سکتے ہیں۔ میں چونکہ خلوت کی قدر کرتی ہوں اس لئے نہ میں نے خان صاحب کے پردوں سے اندر جھانکا نہ ہی شاب صاحب کی خاموش چلن کو سر کاٹنا چاہا۔ ممکن ہے کہ شاب صاحب اور خان صاحب دونوں ایک دوسرے کے سرست رازوں سے واقف ہوں لیکن اس کی سہ کسی تیسرے کو نہیں لگ سکتی۔ چونکہ میں شاب بھائی کو قیافوں سے جانتی ہوں اور اشفاق خان نے اپنے وجود کے گرد گفتگو کی باڑھ لگا رکھی ہے،

اس لئے آج تک مجھے علم نہ ہوسکا کہ شاب بھائی کو خان کس حد تک کیسے اور کیوں کر جانتے تھے؟۔ شاب بھائی کا معمول تھا کہ جب وہ لاہور آتے تو بیسہ داستان سرائے میں ٹھہرتے۔ اگر وہ کار سے آتے تو کبھی ٹھنڈی نہ بجاتے۔ اگر ہوائی جہاز یا ٹرین سے ان کی آمد ہوتی تو بھی وہ کبھی ٹھنڈی پر ہاتھ نہ رکھتے۔ اشیر خان ہی جلجت میں گھنٹیاں بجاتے اور اگر ڈرائیور ساتھ ہوتا تو وہ یہ تیزیاں دکھاتا۔ شاب بھائی پورے پندرہ برس داستان سرائے آئے۔ میں نے کبھی انہیں ٹھنڈی بجاکر اندر آتے نہیں دیکھا۔

اگر وہ کسی پھوٹے سے ذاتی کام یا سیر کے لئے بھی باہر جاتے تو واپسی پر ہمیشہ لمبا اور لگی کا بعلی دروازہ اختیار کرتے۔ آہستہ آہستہ چلتے ہوئے پچھلے برآمدے کے دروازے تک پہنچ جاتے۔ اگر دروازہ کھلا پلتے تو اندر آجاتے ورنہ اندروالی لان میں ٹھلنے لگتے پھر جب کوئی برآمدے میں اچانک آتا تو ان کے لئے دروازہ کھول دیتا۔ دروازہ کھلنے پر انہوں نے کبھی شکایت نہ کی کہ ”بھئی میں تو پون گھنٹے سے کھڑا ہوں تم لوگ کہاں تھے یا یوں کہہ کر بڑی تھی بڑی تکلیف ہوئی“

شاب بھائی کسی پروہج ڈال کر گلہ گزاری کے ساتھ احسان جتاکر، اپنی اہمیت نہ بتاتے تھے۔ وہ بڑے سادہ دارن طریق سے آتے اور ترنت اپنے کمرے میں چلے جاتے۔ ہمارے گھر کے بڑے بھانک سے ملحق سلا کرہ شاب بھائی کا تھا۔ ہم اب بھی اسے شاب بھائی کا کرہ کہتے ہیں۔ اس کمرے میں کاسٹی قالین، دو عدد سادہ سفید پٹنگ، ایک چالیس سالہ پرانی سفید ڈرننگ ٹیبل جس پر عام طور پر خالی پاؤڈر کا ڈبہ، کسی لڑکی کا بھولا بسرا ہیئر برش اور ایک چھوٹا لمبو ترائیڈل کا خالی گلدان دھرا رہتا ہے۔ شاب بھائی اسی ڈرننگ ٹیبل پر اپنا چھوٹا سا ساپ والا بیگ رکھا کرتے۔ شروع شروع میں وہ اپنا تولیہ اور ٹائٹ سوٹ ساتھ نہیں لاتے تھے۔ لیکن کچھ سفروں کے بعد شاید انہیں علم ہو گیا کہ صاف تولے کے لئے بڑی ڈھونڈ پڑتی ہے تو وہ بغیر بتائے اگلی بار سے اپنا سبز ٹکڑیوں والا تولیہ ساتھ لانے لگے۔

وہ ڈرننگ ٹیبل پر چھوٹا بیگ چھوٹی میز پر الارم کی گھڑی اور سپیڈر پٹنگ پر اپنے کپڑوں والا بیگ رکھتے۔ شاب بھائی عام طور پر سلپرز ساتھ نہیں لاتے تھے۔ وہ کوئی معمولی چیز مانگ کر میزبان کو بڑا شرف بڑی اپنائیت بخشتے تھے۔ ان کے سامان میں ضرورت کی تمام چیزیں موجود ہوتیں۔ کئی بار سلپرز بھی ساتھ ہوتے لیکن وہ دلنشین مسکراہٹ کے ساتھ کہتے ”اشفاق سلپرز ہے کوئی؟“

یہ سن کر سارے افراد خانہ اپنے اپنے سلپران کے پیروں تک پہنچانا چاہتے۔ اسی ضمن میں مجھے یاد آیا کہ ایک بار میرے بڑے بیٹے انیق خان نے اپنے سلپرز انہیں دیے۔ یہ سلپرز انارکلی سے ایک ایسی ریزمی کی خرید تھی جس کا دکا انداز سلپروں کا ساڑز دیکھنے کے لئے بھی انہیں ہاتھ لگانے میں دیتا تھا۔ انیق خان کے سلپرز ریزمنا پسند کے تھے اور نیچے سے ان میں ایسی جھریاں بنی تھیں کہ پانی ان میں کھڑا

ہو جاتا تھا۔

ایک روز شہاب بھائی باورچی خانے میں آتے ہوئے بولے ”یار اشفاق یہ کیسے سلیر ہیں؟“۔
”کیوں کیا ہوا؟“۔

”آج صبح جب میں وضو کر رہا تھا تو مجھے چوں چوں کی آواز آئی۔ میں نے سوچا کہ شاید کوئی چوہا ہے۔ میں بیڈروم میں آ گیا لیکن آواز ختم نہ ہوئی تو مجھے پتہ چلا کہ آواز سلیروں سے آتی ہے۔“

خان صاحب کو Anecdotes بیان کرنے کا جو ملکہ ہے وہ اس درجہ خداداد ہے کہ کوئی اور اگر ان کا کتابیا ہوا واقعہ دوبارہ سنائے تو بے معنی ہو جاتا ہے۔ یہاں انہوں نے ریڑھی والے کا رویہ خاص اور جوتی کے چٹاؤ پر اتنی خوبصورت گفتگو کی کہ ہمیں بھول گیا انیق خان شرمندہ سے کھڑے جوتی واپس لینے کے متعلق جملے بند رہے ہیں اور کہہ نہیں پاتے..... پتہ نہیں یہ خان صاحب کی ہار سنگار جیسی گفتگو تھی یا دونوں میں چپ کا گہرا رشتہ تھا۔ لیکن کوئی ایسی بات ضرور تھی جس کی وجہ سے وہ دونوں ساتھ ساتھ رہنا پسند کرتے۔ ایک روز بازار سے واپسی پر شہاب بھائی بولے۔ ”ہائو..... ہو سکا تو آج کے بعد میں اشفاق کے ساتھ بازار نہیں جاؤں گا..... یہ بہت تیز چلتا ہے اور میں پیچھے رہ جاتا ہوں۔ یہ بہت بھاؤ تاؤ کرتا ہے اور مجھے الجھن ہوتی ہے.....“۔

”ہائے کیوں شہاب بھائی“۔
”آج ہم ایک لوٹا خریدنے گئے تھے..... ساری انار کھلی، سارا موچی گیٹ گھوم پھر آئے..... لیکن لوٹا نہیں ملا.....“۔

”ایک معمولی ٹوٹی والا لوٹا نہیں ملا.....؟“ میں نے سوال کیا۔

”اگر میں ہوتا تو پہلی دکان سے لوٹا خریدتا اور گھر آ جاتا لیکن تمہارا شوہر تحقیق کا آدمی ہے۔ کسی دکان پر لوٹے میں پانی بھرا کر اس کی دھار دیکھتا تھا۔ کسی دکان میں ٹوٹی کے ساتھ منہ لگا کر سانس چھوڑتا تھا۔ کسی لوٹے کا رنگ اچھا نہ نکلا، کسی کی بناوٹ، اس لئے ہم دونوں بے پیندے کے واپس آ گئے خالی ہاتھ.....“۔

بادو دیکھ لوٹے کی خریداری میں شہاب بھائی کو بڑا عذاب اٹھانا پڑا لیکن پھر بھی وہ خان صاحب کے ساتھ بازار جانا پسند کرتے رہے۔ جب خان بھاؤ تاؤ کرتے اور اس کر اس ٹاک میں دکاندار سے سیاست، علم، آزادی نسواں تک کی رائے معلوم کر لیتے تو شہاب بھائی پاس کھڑے بڑی حیرت، خوشی اور دلچسپی سے باتیں سنتے نظر آتے۔ انہوں نے کبھی دخل در معقولات نہیں کی..... نہ ہی خان صاحب کے اس شغل پر اعتراض کیا۔ جب پھل کار میں لد جاتے اور وہ فرنٹ سیٹ پر خان کے ساتھ بیٹھتے تو کبھی کبھار کہتے ”یار جب تو دکاندار کو پیسے زیادہ دے آتا ہے اور اس کی منہ لگتی قیمت ہی بالآخر دیتا ہے تو اتنی

بٹ کیوں کرتا ہے۔“

خان صاحب جواب دیتے ”اگر مول تول نہ کروں..... سودے پر تبصرہ نہ ہو تو دکاندار میرے قریب کیسے آئے؟ میں اس سے باتیں کیسے کروں؟ اس کی رائے کیسے معلوم کی جائے؟ سیاست پر..... اسلام پر..... بحث پر..... عورتوں پر..... آج کے اسباب زوال امت پر؟“۔

جس وقت شہاب بھائی کاسنی کمرے میں اترتے تو اس کے بعد سب لوگ اس حجرے کے پاس سے خاموشی سے آنے جانے لگتے۔ انہوں نے کبھی کسی کو ٹوکا نہیں۔ شور مچانے، دنگنا سدا کرنے سے منع نہیں کیا لیکن جب وہ کاسنی خلوت خانے میں ہوتے خود بخود آوازیں دھیمی پڑ جاتیں لڑکیاں ہنستے ہنستے رک کر پوچھتیں ”انکل شہاب اندر ہیں؟“۔ نوجوان ایک دوسرے کے کندھے پر ہاتھ مار کر کہتے ”چلو یار باہر چلیں انکل شہاب سو رہے ہیں سڑک پر کرکٹ ہوگی.....“۔

شہاب بھائی ضرورت کی چھوٹی چیزیں مانگ کر میزبان کا مان بڑھاتے تھے لیکن الارم والی گھڑی انہوں نے کبھی نہیں مانگی ہر سفر پر یہ ان کے ساتھ ہوتی۔ رات کے پچھلے پر تہجد سے کچھ پہلے اس کی ہلکی سی ٹنک ٹنک سنائی دیتی پھر وہ یکدم بند ہو جاتی..... اس کے بعد نہ جانے ان کے معمولات کیا ہوتے؟ لیکن سورج چڑھنے سے بہت پہلے وہ سیر کے لئے نکل جاتے۔ اس سیر کے لئے انہیں انیق خان نے ایک بڑی طرح دار چھتری بنا کر دی تھی جو وہ ساتھ لے جاتے کیونکہ ماڈل ٹاؤن کے آوارہ کتے ناہنجار بھی تھے اور زبان دراز بھی..... رات ہی کو وہ پھانک کی چابیاں اپنی الارم کی گھڑی کے پاس یا فیوز باکس میں لٹکا لیتے..... ان کی کسی احتیاط میں اصرار نہ تھا۔ نہ ہی وہ چابیوں کے لئے کبھی شور مچاتے..... ”اوہ بھئی چابیاں کہاں ہیں؟۔ رات کو کہاں رکھتے ہو چابیاں..... مجھے دے کر کیوں نہیں سوتے؟“ وہ چوری چوری رات ہی کو چابیوں کا ہتھام کر لیتے..... صبح وہ بے پاؤں اٹھتے، برآمدے میں سے گزرتے، کالے پھانک کا تالا کھولتے اور سیر کو نکل جاتے۔

شہاب بھائی انجاناً کے مریض تھے انہیں برسوں سے شوگر آتی تھی ان کی ایک ٹانگ کے سارے اعصاب خراب تھے وہ ہر سال معائنے کے لئے لندن جاتے اور جو کچھ ڈاکٹر کتا من و عن اس پر عمل کرتے۔ شہاب بھائی نہ تو اس لئے علاج کرواتے تھے کہ انہیں اس اپانے پر اعتماد تھا۔ نہ ہی اس لئے لندن عازم ہوتے کہ وہاں کا دوا دار و بہتر تھا۔ بس وہ ماننے والوں میں سے تھے اور علاج کے معاملے میں جو حدود مقرر ہو گئی تھیں ان سے تجاوز نہیں کرنا چاہتے تھے۔ اگر ان کے بدوں نے بیماری میں کوئی چارہ کروایا تو وہ بھی علاج معالجہ کے لئے حاضر تھے..... پہلے پھل جس ڈاکٹر سے لندن میں بن باس کے دنوں ملاقات ہو گئی اسی کا بندوبست جاری رکھا۔ وہ ڈاکٹروں پر اعتماد کئے بغیر ان کا حکم ماننے رہے ایک حکم اس میں سیر کا بھی تھا۔

چمل قدمی سے واپسی پر ان کے ساتھ عام طور پر چھوٹا سا کوئی واقعہ بھی ہمراہ ہوتا جو انہیں مطالعہ قدرت کے دوران پیش آیا ہوتا۔ کوٹھیلوں کے نام، دھوبی گھاٹ، راہ میں ملنے والے دوسرے سیر کے شوقین، دودھ لے جانے والے گجر، اخبار تقسیم کرنے والے نوجوان، کسی کسی گھر میں صبح کے وقت ٹیکسی یا کار سے اترنے والی سواریاں، راستوں پر کوئی کوئی کھانا لگا اور تقریباً سبھی بند گئی..... ایشی کی باڑھوں سے پھر سے اڑ جانے والے پرندے، دیہاتک جلتے رہنے والے سڑک کے قحقے..... وہ اس ہواخوری سے کچھ نہ کچھ جن کو ہمارے لئے ضرور لاتے تھے۔ ان کا مشاہدہ اتنا تیز تھا کہ ہر نئی دیکھ کے ساتھ پرانا تجربہ ملا کر ایسی خوش رنگ اور مزاح آمیز گفتگو کرتے کہ صبح صبح دل تمام کم دھرتوں سے پاک ہو جاتا۔ بات شروع کرتے..... ”اشفاق..... اگر تمہارے گھر سے دائیں طرف مڑ کر چلنا شروع کرو تو پہلے کر اسنگ کے پاس زسری آتی ہے اس سڑک پر کوئی سو قدم کے بعد ایک ہوسٹلر ہاؤس ہے۔ آج اس کے سامنے میں نے ایک دودھ والے کو کیشی کے ٹککے سے دودھ میں پانی ملائے دیکھا۔ دودھ میں پانی ملانے کے بعد آمیزش والا دودھ ہتھیلی میں ڈالا اور بڑے لطف سے اسے پکھا۔“

شہاب بھائی کی باتوں میں جو سہولت اور لذت محسوس ہونے لگی یہ بہت بعد کی باتیں ہیں۔ کچھ وقت ایسے بھی ان کے ساتھ آتے تھے جب میں بارے عزت کے کمرہ چھوڑ جاتی تھی لیکن اندر ہی اندر کڑھتی رہتی تھی۔ یہ وقت وہ تھا جب خان شہاب بھائی کے پاؤں ہاتھ میں لے کر نیچے بیٹھے اور عینک لگا کر ان کے ناخنوں کو دیکھنے لگتے۔ وجہ یہ تھی کہ شہاب بھائی کے انگوٹھوں میں جو ناخن اگتے ایسے ناہنجار ہوتے کہ سید صاحب ہار ٹکٹے کے بجائے اندر کی ریف مڑ کر گوشت میں پیوست ہونے لگتے۔ یہ ناخن خان صاحب بڑی پریت سے، جیسے کوئی لڑکی گڑیا کو کپڑے پہناتی ہے، کاٹا کرتے تھے، وہ بار بار پلائیر فرمائیل کٹڑو کا چبختے شہاب بھائی کا چہرہ دیکھتے اور پھر ہاتھ تول کر ناخن کاٹنے لگتے۔ شہاب بھائی بوے تشکر سے کہتے۔ ”یار اشفاق جب سے تم میرے پیڑی کیور سٹ بنے ہو مجھے برا آرام ہو گیا ہے ورنہ کئی بار تو مجھے اس وقت تک انتظار کرنا پڑا تھا جب تک لندن جانے کی صورت نہ پیدا ہو“۔ شہاب بھائی ناخن کٹواتے رہتے، خان ناخن کاٹتے رہتے اور میں کمرے سے باہر سوچتی کیا یہ عمل ضروری ہے؟۔ جب شہاب بھائی سکھی سے ہو کر اپنے کاسنی کمرے میں چلے جاتے تو میں خان صاحب سے کہتی..... ”میں نے سنا ہے باٹا کے اوپر ایک قابل پیڑی کیور سٹ بیٹھتا ہے آپ شہاب بھائی کو وہاں کیوں نہیں لے جاتے؟۔ جب آپ یوں سر جھکا کر ان کے پیروں میں بیٹھتے ہیں تو مجھے بڑی تکلیف ہوتی ہے“۔ خان لالعلقی سے کہتے..... ”تمہیں معلوم نہیں شہاب کی جلد بہت نرم اور ناخن بہت سخت ہیں قدسیہ نہیں مجھ سے بہتر اور احتیاط کے ساتھ کوئی نہیں کاٹ سکتا“۔ ایک بار جب ناخن کٹ گئے اور شہاب بھائی نے سکھ کا سانس لیا تو قدرے توقف کے بعد وہ بولے..... ”اشفاق یار زندگی کا کچھ پتہ نہیں ہوتا کیا یہ تیری میری لڑائی ہو جائے اور ہماری بول چال ہی بند ہو جائے لیکن یار میری ریکورسٹ ہے کہ میرے ناخن کاٹنے نہ چھوڑنا۔ تب خان کے اس عمل کے ساتھ میں مشتاق نہیں تھی اس لئے میں نے اس کمرے میں رہنا چھوڑ دیا۔ پھر وقت گزرنے پر، کچھ اور جتیں کھلنے پر، پردے اٹھنے کے بعد، تھوڑی سی راہ ملنے پر میرا رویہ بالکل بدل گیا۔ اب خان صاحب اسلام آباد جانے لگتے تو میں پوچھتی..... ”خان..... وہ ناخن کاٹنے والی کٹ ساتھ رکھ دوں؟“

شہاب بھائی لاہور آتے تو میں کتنی ”خان جی..... شہاب بھائی سے پوچھ لیں ناخن تنگ نہ کرتے ہوں.....“۔ جب خان صاحب ناخن کاٹ رہے ہوتے تو میں بولتی رہتی ”یہ کنرا لکل بے کار ہے اتنا زور لگتا ہے خان صاحب آپ پلیز جاوید طارق سے کہیں وہ باہر آتا جا تا رہتا ہے ایک کٹ تولے آئے مناسب قسم کی.....“۔

یہ فقیر لوگ بڑے ڈانڈے ہوتے ہیں آپ کے دشمن سے جیپھی ڈلو کر رہتے ہیں۔ جہاں آپ شادی نہیں کرنا چاہتے وہیں کروا دیتے ہیں۔ جس بیوی کو آپ چھوڑنا چاہتے ہیں اسے ہی پٹ رانی بنا دیتے ہیں۔ ساگ پات، بیگنکے، کھیرے، چٹنی، روٹی آپ کی خوراک بن جاتی ہے۔ لوگوں کا پاشویہ کر کے آپ سمجھتے ہیں کہ یہ ان کا ہی احسان ہے کہ پاؤں دھونے کو دیئے۔ آپ کو پتہ نہیں چلتا اور آدمی رات کو آپ کی آنکھ کھلنے لگتی ہے۔ خیرات لینے والوں کا شکر یہ ادا کر کے راحت ملتی ہے۔ لوگوں کا گلہ سن کر چپ رہنے کی عادت ڈال دیتے ہیں۔ یہ ڈانڈے لوگ اوکھے لوگوں کے ساتھ اور بھی ڈانڈے ہوتے ہیں۔ خان صاحب بابا نور والے کے ڈیرے پر جایا کرتے تھے۔ ایک بار شہاب بھائی نے مجھے ہنس کر کہا..... ”بانو اشفاق ڈیرے پر بڑی باقاعدگی سے جاتا ہے۔ یہ ڈانڈے لوگ ہوتے ہیں یہ فقیر بابا جی جیسے..... روٹی بوٹی کھلاتے ہیں اور انسان اپنے دانتوں سے اپنی قبر تیار کر لیتا ہے۔ یہ گھسیٹ گھسٹ کر، توتہمبو کر کے، پیار و یار سے ادھر کے رستے پر ڈال دیتے ہیں پھر پروا نہیں کرتے کہ آپ پر کیا بیت جاتی ہے۔ ان کا بس اتنا ہی کام ہے۔ کھوٹی ہوئی بھیٹریں جمع کرنا..... راستے پر ڈالنا اور بس پھر بھیڑ جانے اور بھیڑوں والا جانے یہ پروا نہیں کرتے۔

شہاب بھائی کے جانے کے بعد مجھ پر یہ حقیقت کھلی کہ وہ بھی بڑے ڈانڈے تھے انہوں نے بھی خان صاحب کے ساتھ اچھی کی..... پریت سے ناخن کٹوائے۔ بن بولے تشکر سے موم کیا..... بھیڑ کو جنگلوں کے راستے پر ڈالا اور اپنے کندھے پر بھورا ڈال رخصت ہو گئے۔ میں ان دونوں کے اندر دنی رابطے کو نہیں سمجھ سکی۔ شاید کچھ تھا..... شاید نہ تھا۔ میں یہاں اشفاق احمد کا ایک مضمون جو انہوں نے پشاور میں پڑھا من و عن لکھتی ہوں تاکہ آپ اندازہ لگا سکیں کہ خان کا رشتہ شہاب بھائی کے ساتھ کیا تھا؟۔ اس میں کتنی دوستی، کیسی رفاقت اور کس قدر عاجزانہ خود سپردگی تھی؟۔

”چندن کا پیڑ“

میں سمجھتا ہوں کہ اب یہ بات کہہ دینی چاہئے اور اس کے کہنے میں کسی قسم کی معذرت کو یا کسی حیلے کو سہارا نہیں بنانا چاہئے اور کسی عذر خواہی کے بغیر اس کا اعلان کرونا چاہئے کہ میں قدرت اللہ شہاب صاحب کا خلیفہ ہوں اور واحد خلیفہ ہوں کیونکہ انہوں نے خود اپنی زبان سے دو مرتبہ واشکاف الفاظ میں بیان دیا تھا کہ ”اشفاق احمد میرا خلیفہ ہے۔ میں اس کو اپنے خلیفے کے طور پر قبول کرتا ہوں“ اور اس کے لئے دعا کرتا ہوں..... ”پھر انہوں نے میری بیوی سے مخاطب ہو کر فرمایا تھا کہ میں اشفاق کے لئے اور اس کے گھرانے کے لئے اور اس کے بچوں کے لئے دعا کرتا رہوں گا اور خداوند کریم سے چاہوں گا کہ وہ میری دعائیں قبول فرمائے اور اس کے گھرانے کو خیر کثیر عطا فرمائے۔

جب دعا ہو چکی تو میری بیوی نے مجھے ایک طرف لے جا کر کہا ”اب اس بات کو چھپا کر رکھنا اور کسی کے سامنے اس کا اظہار نہ کرنا اور نہ ہی وہ عمل کرنا جس سے کسی کو شک پڑے کہ تم ان کے خلیفہ ہو اور تم کو انہوں نے اپنی خلافت کے لئے چن لیا ہے“۔

دراصل میری بیوی کو اور ممتاز مفتی کو شروع ہی سے قدرت اللہ شہاب کے نام سے چڑھتی اور مجھے ان دونوں کی آنکھ بچا کر شہاب سے ایسی پوشیدہ جگہوں پر ملنا پڑتا تھا جہاں کسی کو گمان بھی نہ گزرے کہ ایسی غیر منہذب اور غیر معزز جگہوں پر لوگ ایک دوسرے کے ساتھ لمبی لمبی سہریں اور چھوٹی چھوٹی مغریں مگن کر سکتے ہیں۔ دراصل ہم کو ایک دوسرے کے ساتھ لمبی لمبی بلکہ بہت لمبی باتیں کرنے کا بڑا شوق تھا جن میں عام طور پر چھوٹی بڑی کیمیکوں کے تفصیلی تذکرے ہوتے تھے اور ان میں بہت سے جانے پہچانے نام کپڑے دھونے والی مشینیں میں جچھٹیاں ڈالنے اور دھکے دینے کپڑوں کی طرح گھومتے رہتے تھے۔ کئی سال بعد ان اثناء بھی ہمارے ساتھ آلا اور ہمارا عملہ ادارت اور بھی فعال ہو گیا۔ بانو قدسیہ کو ہماری سنگت کا ابن انشاء بہت پسند آیا لیکن قدرت اللہ شہاب سے وہ بدستور کشیدہ رہی۔

بر اور فضل بردار نہیں تھا۔ خود انعام اور خود فضل تھا۔ یہ بات میں کسی روحانی سلسلے یا تصوف کے حوالے سے نہیں کہہ رہا۔ خالص دنیا داری کے رخ سے کہہ رہا ہوں کہ شباب کے قریب رہنا خیر کے ساتھ رہنا تھا اور اس کے ساتھ منسلک ہونا ہر طرح کی یافت سے وابستہ ہونا تھا۔ کبھی کبھی اخباروں میں چھپتا ہے یا لوگوں کی زبانی پتہ چلتا ہے کہ شباب کے یاروں نے اس کی ذات سے کس قدر فائدہ اٹھایا ہے تو مجھے بڑی خوشی ہوتی ہے۔ واقعی جو بھی اس کا یار تھا خوش قسمت تھا جو بھی اس کے قریب تھا مالامال تھا۔ ہم نے اس سے جی بھر کے فائدہ اٹھایا۔ اتفاقاً کہ کوئی انسان کسی انسان سے اٹھا ہی نہیں سکتا۔ مال و مال، فارغ البال، پر باش، ہم تو بہت قریب کے لوگ ہیں جو شخص اس کے پاس سے بھی گذر گیا یا اس کے خیال سے بھی گذر اس کی زندگی بھی سچھل ہو گئی۔

مجھے یہ تو یاد نہیں کہ کب اور کس وقت اور کس مقام پر ممتاز مفتی اور بانو قدسیہ نے نیا جنم لیا البتہ سردیوں کی وہ صبح اچھی طرح سے یاد ہے جب بانو نے بڑی لجاجت سے کہا ”میری ایک بات مانیں گے“۔ تو میں کچھ خوفزدہ سا ہو گیا تھا۔ اس نے کہا ”آپ شباب بھائی کو ”تو“ اور ”تم“ کہہ کر نہ پکارا کریں اور اگر کہنا ہی ہو تو کم از کم میرے سامنے نہ کہا کریں“۔

پھر ممتاز مفتی نے اپنے سیٹلائٹ ٹاؤن والے پہلے گھر میں گرج کر کہا ”اوائے تم اندھے ہو؟ بھرے ہو؟ تمہارے وجود کے سارے رستے سیل بند ہو چکے ہیں کیا۔ اوائے تم کو نظر نہیں آتا کہ وہ کون ہے۔ مجھے ہونے وجود کیا تمہاری ذات کے سارے ہی انٹینسٹی اور ایریل شارٹ سرکٹ ہو گئے ہیں۔ تم انسان ہو کہ کیا ہواوے“۔ لیکن خدا شاہد ہے کہ مفتی کے کہنے کے باوصف اور اپنا سارا زور لگانے کے باوجود مجھے تو کچھ بھی نظر نہ آیا۔ میں کچھ ایسا ڈفر بھی نہیں ہوں۔ کچھ ایسا برا، گند اور ناپاک بھی نہیں۔ کوئی خاص کم علمی بھی نہیں پھر میں سوچنے، جاننے اور محسوس کرنے کی آرزو بھی رکھتا ہوں لیکن میرے سارے خانے خالی ہیں کم از کم وہ سارے خانے ضرور خالی ہیں جو مفتی جیسے لوگوں کے گھرے ہوئے ہیں۔

بانو اپنے تئیں بیٹوں کو لمبے صوفے پر بٹھا کر اور خود نیچے قالین پر بیٹھ کر کہا کرتی ”دیکھو بیٹا! ہم بڑوں جیسے تو نہیں بن سکتے۔ کیونکہ یہ ہمارے لئے طے نہیں ہوا ہے۔ یہ ہماری برات نہیں ہے۔ لیکن پیارے بیٹو ہم ان کے قریب ان کے ساتھ ساتھ ان کے نزدیک تو ضرور رہ سکتے ہیں۔ ان کی حد نگاہ میں تو ضرور آ سکتے ہیں۔ ان کے کارندے تو بن سکتے ہیں۔ اس لئے میرے پیارے بچو جب شباب بھائی آئیں تو ان کے قریب قریب رہا کرو۔ گھر سے باہر نہ جایا کرو۔ جایا کرو تو جلد لوٹ آیا کرو۔ بہت قریب نہ ہو سکو تو ایک ہی پھت کے نیچے رہنے کی

ممتاز مفتی کو اور میری بیوی کو اونچے درجے کے سرکاری افسروں سے ایک عجیب طرح کی کد تھی۔ ممتاز مفتی ہر بڑے افسر اور نامی گرامی بیورو کریٹ سے اس وقت تک نہ کھلتا تھا جب تک کہ ٹھیکے مار کر اس کو نیچے نہ گرا لیتا اور اس کی چھاتی پر اپنا دامن پیر رکھ کر یہ صدا بلند نہ کر لیتا کہ ”بھئی ہمارے لئے کہیں سے دو کر سیاں بھجواؤ۔ بڑے صاحب تشریف لائے ہیں۔ ان کے لئے کوئی چائے پانی کا بندوبست کرو“۔ اور بانو قدسیہ کو صرف یہ خوف رہتا تھا کہ لوگ دیکھیں گے تو افسر بازی کا طعنہ دیں گے اور کہیں گے کہ ان لوگوں نے اپنی زندگی اپنی محنت سے خود نہیں بنائی بلکہ افسروں کے رسوخ کی وجہ سے سفارشی سارے پر بنائی ہے۔ ان دونوں میاں بیوی کے اپنے ہاتھ پہلے کچھ نہیں افسروں کے کا سہ لیں ہیں اور مشکل یہ تھی کہ شباب نہ صرف ایک افسر تھا بلکہ بہت بڑا افسر تھا۔ کسی حد تک سب سے بڑا تھا کیونکہ اس کے فوراً بعد صدر مملکت آ جاتا تھا اور پھر مملکت خدا واد کی حدیں ختم ہو جاتی تھیں۔۔۔۔۔ بانو قدسیہ کا تقاضا یہ تھا کہ پہلے شباب صاحب کو ریٹائر ہو لینے دو ان کو ایک بے معنی، بے کار، بے وسیلہ اور بے حال شخص بن لینے دو پھر میں ان کی طرف رجوع کروں گی اور تمنا کی مشکل یہ تھی کہ وہ کئی ٹھیکیاں چلا چکا تھا اپنے ساتوں دائر استعمال کر چکا تھا لیکن شباب ڈھیتا نہیں تھا۔ ڈھیتا اس لئے نہیں تھا کہ اس نے کبھی غم ہی نہ ٹھونکا تھا۔ اکھاڑے میں ہی نہ اترتا تھا۔ بڑھک ہی نہ ماری تھی۔ دعویٰ ہی نہیں کیا تھا۔ مفتی پریشان تھا اور بانو محبوب تھی اور میں خوش تھا کہ اپنے ان دو پیاروں کو ایک طرف کر کے مجھے شباب سے ملنے کا اور وقت مل رہا ہے اور گھومنے پھرنے کی مکمل آزادی ہے۔

اصل میں آج تک میرے سارے کام انسانوں نے ہی کئے ہیں اور اللہ تعالیٰ کے لطف بے پایاں اور خیر کثیر کے مجھ تک پہنچنے کا سامان ہمیشہ بندوں نے ہی کیا ہے۔ بیماری میں میرا علاج ہمیشہ کسی انسان نے کیا۔ باعزت طور پر بری انسان نے کیا۔۔۔۔۔ نعمتیں ہمیشہ بندے ہی اٹھا کر، دھو کر، کاٹ کر، سجا کر لائے۔ جب اللہ نے مجھے خوش کرنا چاہا تو لوگوں سے ہی تالی بوائی۔ جب مجھے محبت عطا کرنی چاہی تو کسی شخص سے ہی مجھے جیتھی ڈلوائی۔ جب میں نے سفر کا ارادہ کیا تو ایک بندے کو ہی میرا پالٹ بنایا۔ مجھے پیسوں کی ضرورت پڑی تو پہلے کلرک نے ہی مجھے پیسے لا کر دیئے۔ لیکن جو شخص مجھے ہمیشہ ایمر ہو سٹل نے پلایا اور میاں محمد صاحب کے شعر مجھے بندے نے ہی سنائے۔ اس کا فضل اور اس کا کرم مجھ پر ہمیشہ کسی انسان کی معرفت ہی پہنچا۔

لیکن شباب تو ان سب بندوں سے ان سب آدمیوں سے بہت ہی مختلف تھا۔ وہ انعام

کوشش تو کیا کرو۔ شباب بھائی چہن رکھ ہیں۔ مندل کا بیڑ ہیں۔ ان کی جھاؤں بھی ہے اور خوشبو بھی۔ یہ دو ابھی ہیں اور شفا بھی ہے..... اس کے ارد گرد رہا کرو۔ ان کی قربت سے فائدہ اٹھایا کرو..... سنو پیارے بچو! اپنا وجود مندل کے وجود سے مس کرتے رہو۔

لکھ لکھ بدیاں سوسوٹنے سبھو سرے سے دو

نال جن دے ریئے دو

خن جنہاں داہو دے دارو حال اتھائیں کئے دو

چہن رکھ لگاؤچ ویرھے زور دکھائے کھپتے دو

رہئے دو

کے حسین فقیر سائیں داچیو ندیاں مر رہئے دو

نال جن دے رہئے دو

اس کے تنے کو چپھا ڈال کر کھڑے رہو۔ کچھ نہیں کرنا۔ کچھ نہیں کہنا۔ کچھ نہیں مانگنا۔ بس چہن رکھ کے ساتھ اور اس کے قرب رہنا ہے۔ اس کے ساتھ لگ کر زندگی بسر کرنی ہے۔ خوشبوئیں خود بخود تمہاری ذات کا حصہ بن جائیں گی۔

بچے پوچھتے ”امی ٹھیک کتنی ہیں ابو؟“۔

میں کہتا ”بھائی مجھے کیا معلوم۔ تم جانو اور تمہاری ماں جانے۔ لیکن اگر تمہیں اسی قدر شک ہے تو پھر تم شباب چچا کے آنے پر اتنا زیادہ گھر پر کیوں رہتے ہو۔ کیا تمہارے دوست دوستیاں نہیں ہیں؟ کیا تمہیں پہلے کی طرح کام نہیں ہوتے۔ کیا تمہاری آشتیاؤں کی ساری روشنیاں گل ہو جاتی ہیں“۔ لیکن میرے خیال میں بچے باپوں کے مقابلے میں ماؤں سے زیادہ متاثر ہوتے ہیں۔ جب ان کی ماں شباب چچا کے آجانے پر ان کے معصوم کانوں میں لوٹ سیل!! ”تستے سووے“، ”اچے سووے“ پھونکتی رہے اور بار بار

Profiteer Profiteer Capitalize Exploit

کتنی رہے تو اس کا بچوں کے دماغ پر اثر ہوتا ہی ہوا..... میرے گھر میں سارے بچوں پر اور ان کے دوستوں پر اور ان کے دوستوں کے دوستوں پر کچھ ایسا جادو جگا ہوا تھا کہ شباب صاحب کے آجانے پر وہ سارے ان کے گرد پروانوں کی طرح جمع ہو جاتے اور اپنی اپنی مشکلات علیحدگی میں یا سب کے سامنے ”انکل شباب“ کو بتا کر ان سے رائے لیتے رہتے۔ بیگر جزیشن میں شباب صاحب سے زیادہ پاپولر ”بابا“ میں نے اور کوئی نہیں دیکھا۔ مجھے پتہ تھا کہ چونکہ وہ نوجوانوں کی ہریات خندہ پیشانی سے سن لیتے ہیں اور کسی کو کسی بات پر سرزنش نہیں کرتے، جھنجکی نہیں

دیتے اس لئے پاپولر ہیں۔ لیکن جلد ہی نوجوانوں کے اس گروہ کے بعد ملازموں کے پھر محلہ واردوں کے اور بزرگوں کے اور خواتین کے اور نیم دانشوروں کے اور جھدارنیوں کے گروہ آنے شروع ہو گئے اور شباب صاحب سے پتہ نہیں ان کو کون سی گیدڑ سنگی ملے گی کہ اس جم غفیر میں اضافہ ہی ہوتا گیا۔ مجھے سب سے بڑی شرم اس بات پر آتی تھی کہ اگر میرے ہم عصر ادیبوں، شاعروں اور صحافیوں کو اس بات کا علم ہو گیا کہ اشفاق صاحب کے گھر پر کیا ہو رہا ہے تو وہ میرا بقی ماندہ بھی اپنی برادری سے نکال دیں گے۔ میں پہلے ہی دقہ نوس، رجعت پسند، جمل دوست اور گنوار نواز مشہور تھا۔ میرا کیا بنے گا!۔

میں نے ایک سوچی سمجھی سکیم کے تحت ان بے یار و مددگار ضرورت مندوں اور بے نواو بے آسرا حاجت مندوں کا داخلہ اپنے گھر میں کر دیا اور انہیں اچھی طرح سمجھا دیا کہ تم کو جو کچھ لینا ہے خدا سے لو۔ جو کچھ مانگنا ہے خدا سے مانگو۔ ایک فانی انسان سے رائے لیتے ہوئے اور اس کی باتوں پر عمل کرتے ہوئے اور ایک شخص کو اپنے سے برتر سمجھتے ہوئے تمہیں شرم آنی چاہئے۔ میں نے انہیں بتایا کہ جیسے انسان تم ہو ویسے ہی انسان وہ ہیں۔ جس خدا کی تم مخلوق ہو اسی خدا کی وہ مخلوق ہیں۔ جو صلاحیتیں خدا نے تم کو دی ہیں وہی ان کے پاس ہیں پھر تم اپنے مسائل لے کر ان کے پاس کیوں آتے ہو اور اپنی مشکلوں کو ان سے کیوں بیان کرتے ہو!۔ میرے گھر سے بھیڑ تو چھٹ گئی لیکن میرا گھر انہ جس شبہی پھوار میں برسوں سے لپٹا ہوا تھا اس پر گرم لمحوں کی پیش قدمیاں شروع ہو گئیں اور ہم اپنی کمزور چھتوں کے نیچے کڑی دھوپ کے کوڑے روڑے ہو کر رہ گئے۔

ممتاز مفتی نے زندگی کے ہر نئے ٹوڑ پڑیوں تو ہر شخص اور ہر شخصنی اور ہر صورت اور ہر صورت سے پیار کیا ہے اور بعض اوقات اتنا زیادہ کیا ہے کہ اس کے ساتھ ساتھ ہماری جان بھی ہمیشہ شنبے میں بکڑی گئی ہے۔ ایک تو کلخ اندازوں کی ہر وقت کی سنگ باری کہ ممتاز مفتی یہ کیا کر رہا ہے دوسرے ممتاز مفتی کا ظالمانہ رویہ کہ ہم بھی اس کے محبوب سے اتنی ہی محبت کریں جتنی وہ خود کرتا ہے۔ اس کے بھی اتنے ہی خمرے اٹھائیں جتنے وہ خود اٹھاتا ہے۔ اس کے اٹھنے بیٹھنے پر ہم بھی کم از کم تین مرتبہ بسم اللہ کہیں..... ہم ممتاز سے ڈر کر یہ سب کچھ کرتے تو رہے لیکن اس کی آنے دن کی محبتوں سے متاثر نہیں ہوئے۔ لیکن جو عشق ممتاز مفتی کو شباب کی ذات سے ہوا اور بھری دنیا میں سب کے سامنے ہوا اور جو خود شباب کے منہ در منہ ہوا اس کی مثال شباب کے چاہنے والوں میں سے کسی کے پاس بھی نہیں، نہ گھر والوں کے پاس نہ باہر والوں کے۔ ہم نے کتابوں میں ایسے قصے ضرور پڑھے تھے لیکن اپنی آنکھوں سے ایسا ہوتے

انگوٹھوں کی حالت غیر تھی۔ پنچے سو بے ہوئے تھے انگلیاں موٹی ہو گئی تھیں اور چلتے وقت و

بچی خان کے زوال کے بعد شہاب صاحب جب لندن سے واپس پاکستان آئے تو مگوان کو بہت سی بیماریوں نے گھیر رکھا تھا لیکن ان کی صحت جسمانی کافی اچھی تھی۔ عفت البتہ کمزور کمزور اور بیمار بیمار سی تھی۔ ہم عفت کو پہلے بھی اچھی طرح سے جانتے تھے لیکن اس کی بیماری نے اور پھر لاہور میں بانو کی نگہداشت نے اسے اور بھی ہمارے قریب کر دیا۔ شہاب ہر ہفتے اپنی بیوی کی خبر پوچھنے باقاعدگی کے ساتھ اسلام آباد سے لاہور آتے رہے اور باوقد سیہ لالچی ملی کی طرح اپنے بچے اٹھا اٹھا کر شہاب بھائی کے ارد گرد بٹھاتی رہی کہ شاید اسی طرح وہ روہی سے شیر کی طرف مائل ہونے لگیں۔ کبھی کبھی مجھ سے بھی کہہ دیا کرتی کہ آپ بھی بچوں کے

کہا ”پیڑی کیورنگ ہو رہی ہے۔“

بانو نے آگے جھک کر دیکھا تو میں انگوٹھوں پر مالش ختم کر کے کتابت والی نب سے ناخن کا کوہ اٹھا کر اس کے نیچے روئی کی چھوٹی سی ڈگڈگی پسندارہا تھا۔ بانو میرے کمال فن کو دیکھ کر حیران رہ گئی اور کمرے سے باہر نکل کر دروازہ بھیڑ گئی۔

اس کے بعد میں ہر جمعہ انارکلی میں پرانی کتاب بازاری سے ان رسالوں کو تلاش کرنے لگا جن میں ناخنوں کی حفاظت، انہیں کاٹنے انہیں سیدھا کرنے، انہیں تمیز سکھانے، راہ راست پر لانے اور بگڑنے ہوؤں کو علاج کرنے کے طریق ہوتے ہیں۔ لیکن زیادہ تر مضامین عورتوں کے ناخن رکھنے، ناخن رنگنے اور ناخن بڑھانے کے ملتے تھے لیکن کبھی کبھی کسی رسالے سے میرے مطلب کا مضمون بھی مل جاتا تھا۔

پیڑی کیورنگ پر دو کتابچے میں نے ولایت سے منگوائے۔ ایک بہت بڑا البم متفرق مضامین کی کٹنگ کا ہو گیا۔ جن دواؤں اور لوشنوں کے استعمال کی تجاویز دی گئی تھیں وہ لوشن مقامی طور پر بنوائے۔ ایک ولایتی دوائی بھی مل گئی۔ اب معاملہ اوزاروں کی فراہمی کا تھا کیونکہ ہر مینے ڈیڑھ مہینے بعد مجھے بڑی مشکل کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔

دوئی میں میرا بھانجا جاوید طارق رہتا تھا۔ اس کو پیغام بھیجا کہ مجھے پاؤں کے ناخن کاٹنے کے وہ آلات ولایت سے منگوا کر دے جن کی تصویریں اس پیغام کے ساتھ بھجوائی جا رہی ہیں۔ اس نے مطلوبہ اوزار تو منگوا کر نہ دیئے دوا اعلیٰ درجے کے ”نیل کنز“ اور ایک سیٹ ناخنوں کی حفاظت کے آلات کا بھجوا دیا۔

پاؤں کے ناخن کاٹنے میں ہاتھ کی گرفت اور کٹنی کے زاویہ کا خاص خیال رکھنا پڑتا ہے۔ اوزار پر گرفت جس قدر مضبوط ہوگی کٹنگ اسی اعتماد کے ساتھ ہوگی کٹنگ صحیح ہوگی تو مریض کو تکلیف نہیں ہوگی۔ ہاتھ کے ذرا سے ہل جانے سے گوشت میں گھسے ہوئے کوٹنے تباہی مچا دیتے ہیں اور ڈراس بات کاہوتا ہے کہ مریض درد سے پاؤں کھینچ کر اپنے آپ کو زخمی نہ کر لے۔ ہاتھ کی گرفت صحیح نہ ہو تو ناخن کو نرم کرنے والا لوشن کٹر کے منہ کو پھسلا بھی دیتا ہے۔ اس سے بھی حادثے کا خطرہ ہے۔ کٹنی کا زاویہ ضرورت سے زیادہ اوپر ہو تو کٹنا ناخن کو اوپر سے دباتا ہے اور بڑی شدید تکلیف میں مبتلا کر دیتا ہے۔ کٹنی نیچی ہو تو کٹر کا نیچے کا پھل زیادہ اندر کو جاتا ہے اور اوپر کا پھلتا ہوا پھل گرفت چھوڑ دیتا ہے۔ اس سے بھی کچے ماس کے زخمی ہونے کا اندیشہ رہتا ہے۔

پاؤں کے ناخن کاٹنا بڑا ہی مشکل کام ہے۔ خاص طور پر کسی دوسرے کے کاٹنا۔

صرف ایزویوں پر بوجھ ڈال کر چل سکتا تھا۔ میں نے اسے پٹنگ کی پٹی پر بٹھایا م تکیہ فرش پر ڈال کر اس کی ایزویوں کے نیچے رکھا اور اس کے سامنے قالین پر بیٹھ گیا۔ اس کے دونوں انگوٹھے آماس کی وجہ سے گرم ہو رہے تھے اور ان سے چنگلیں سی پھوٹ رہی تھیں۔ میں نے اس کے دونوں انگوٹھوں کو ایک ساتھ اپنی پولی سی چنگلی میں دبا کر دیکھا تو اس نے درد کے مارے دونوں پاؤں پیچھے کھینچ لئے۔ میں نے دونوں پاؤں مضبوطی سے پکڑ کر پھر تکیہ پر رکھ لئے۔

میرے پاس اٹلی کے زمانے کا ایک ناخن گیر تھا جو پلاس کی طرز کا تھا اور جس کے اندر ایسا ہرنگ لگا ہوا تھا جیسے شاخص کاٹنے والی قینچی کے اندر لگا ہوتا ہے۔ اس نیل کٹری کوچنگ کے ساتھ میں نے بڑی احتیاط سے اندر گئے ہوئے ناخن کا ایک کونہ کاٹا تو شہاب نے سانس چھوڑ کر کہا ”واہ جی وا۔ ٹھنڈ پڑ گئی۔“ مریض سے ایسا حوصلہ افزا ریمارک سن کر میری ہمت میں اضافہ ہوا اور میں نے ناخن کے دوسرے کنارے کو بھی نیل کٹری کوچنگ میں پکڑ لیا تو تکلیف کی وجہ سے شہاب کے چہرے پر شدید کرب کے آثار نمودار ہوئے لیکن اس نے منہ سے کوئی آواز نہ نکالی۔ جب نیل کٹری نک کر کے یہ کونہ کاٹا تو اس نے اپنا پیر جلدی سے نیچے کھینچ لیا اور اس پر کافی سارا بوجھ ڈال کر بولا۔ ”یہ پیر تو چلنے کے قابل ہو گیا۔ بالکل پروفیکٹ لیکن اب دوسرے کا کیا بنے گا؟ میں نے کہا۔“ اتنا تو دوسرا بھی ہو جائے گا۔ آگے کا علم مجھے نہیں آتا“ اس نے کہا ”دیکھو میاں میں ذیابطس کا مریض ہوں اگر خدا نخواستہ پاؤں پر کٹ لگ گیا تو زخم مندمل نہ ہو سکے گا اور بات لمبی ہو جائے گی۔ اس لئے ذرا احتیاط سے کام لینا۔“

میں نے اللہ کا نام لے کر دوسرے انگوٹھے پر بھی اسی احتیاط اور اسی توجہ سے کام کیا تو ادھر بھی ٹھنڈ پڑ گئی۔ جب اس نے اپنے دونوں پیروں پر کھڑے ہو کر قالین کے چاروں کناروں پر چل کر دیکھا تو اس کے چہرے پر وہی خوشی تھی جو پاؤں چلنے والے بچے کے چہرے پر اس روز ہوتی ہے جب وہ ڈمگ ڈمگ چلا تھا اور جس کے ماں باپ بھی فقیروں کی طرح ہاتھ پھیلا کر اس کے ساتھ ساتھ چلے تھے۔ میں اس کے ساتھ تو نہیں چلا البتہ میری مڑتی ہوئی گردن اور گھومتی ہوئی نگاہیں قالین کے چاروں کناروں پر اس کے ساتھ ساتھ چلیں۔ جب وہ خوشی خوشی اپنا چکر کاٹ چکا تو میں نے اسے پکڑ کر پھر اپنے سامنے بٹھالیا اور اس کے نہ نہ کرنے کے باوجود ناخنوں پر تفصیلی آپریشن شروع کر دیا۔

مناسب اوزار نہ ہونے کی وجہ سے یہ آپریشن کوئی چالیس منٹ تک جاری رہا۔ جب میں اس کے ناخنوں کو فائل کر کے ان پر روغن زیتون لگا رہا تھا تو بات قدسیہ اندر آ گئی۔ مجھے اس طرح فرش پر اور شہاب بھائی کو پٹنگ پر بیٹھے دیکھ کر حیران رہ گئی۔ پھر شہاب نے کھیا نے ہو کر

جب میں نے دوسری مرتبہ شباب کے ناخن کاٹنے ان کو اچھی طرح سے ربڑی لگا کر گولایا۔ ان پر سیولون ملے آلیو آئیل کی مالش کی اور دونوں پاؤں کو تیز سیلنگ فین کی ہوا میں تکیہ پر چھڑ کر ہاتھ دھوئے گیا تو بانو میرے پاس غسل خانے میں آئی اور کہنے لگی۔

”شباب بھائی مجھے دنیا میں بہت زیادہ عزیز ہیں اور یہ بھی ساری دنیا میں صرف مجھی پر اپنی بھرپور شفقت کا اظہار فرماتے ہیں، لیکن یہ کچھ اچھا نہیں لگتا۔“

میں نے ہاتھ دھوئے چھوڑ کر ٹوٹی بند کی۔ گھوم کر اس کی طرف دیکھا اور حیرانی سے پوچھا ”کیا اچھا نہیں لگتا۔“

اس نے رندھی آواز میں کہا ”یہ سب کچھ۔ یہ جو آپ کرتے ہیں“

”یہ جو آپ شباب بھائی کے ناخن کاٹتے ہیں۔ وہ بھی پیروں کے“

میں نے کہا ”تو اس میں کیا ہے وہ میرا دوست ہے۔ جانی جان ہے۔ شدید تکلیف میں مبتلا ہے اگر میں اس کی تکلیف رفع نہیں کروں گا تو اور کون کرے گا۔“

”تکلیف تو ٹھیک ہے“ بانو نے کہا ”لیکن آپ کا بھی تو معاشرے میں ایک مقام ہے دروازے چوڑے کھلے ہوتے ہیں اگر آپ کے کوئی رشتہ دار آجائیں۔ آپ کے بڑے بھائی

صاحب..... یا میرے کہنے کے لوگ.....

”تو پھر آجائیں“ میں نے ہنسی سے کہا۔

”اگر کہیں سے ادبوں کو پتہ چل جائے، صحافیوں کو، کالم نویسوں کو..... تو وہ ساری دنیا میں بدنام کر دیں گے۔“

”میں نے ان کا کیا بازو ہے جو وہ بدنام کر دیں گے۔“ میں نے ڈر کر کہا۔

”بگڑنے کی بات نہیں ہے“ بانو نے دکھ بھرے لہجے میں کہا ”وہ سب کو بتا دیں گے کہ اشفاق احمد فرش پر بیٹھ کر قدرت اللہ شباب کے پاؤں کے ناخن کاٹتا ہے۔“

”تو اس میں جھوٹ کیا ہے“ میں نے پوچھا۔

”میں کب کہتی ہوں کہ یہ جھوٹ ہے“ اس نے تنک کر کہا ”جھوٹ نہیں ہے جیسی تو کہہ رہی ہوں۔ کیا آپ یہ کام بند نہیں کر سکتے؟“

”بند کیسے کر دوں بانو۔ اور کوئی ہے ہی نہیں جو یہ کام کر سکے.....

میں نے بڑی محنت کے ساتھ یہ کام سیکھا ہے۔ کیا پتہ کل کسی اور کو اس کی ضرورت پڑ جائے۔“ جب وہ کچھ دیر اور ساکت وصامت کھڑی رہی تو میں نے کہا ”بھئی اس میں برائی کی کیا بات ہے تم لوگ نہیں کیا کرتے اپنی دوستوں کے کام۔“

”اپنی دوستوں کے کام!“ اس نے حیرانی سے پوچھا ”کون سے کام؟“ میں نے کہا ”تم عورتیں ایک دوسری کے آگے بیٹھ کر سر میں تیل ڈلاتی ہو۔ کتنی کرتی ہو۔ جو میں نکلواتی ہو۔ اس وقت تمہاری بے عزتی نہیں ہوتی۔“

بانو نے کہا ”وہ تو گاؤں میں ہوتا ہے۔ پڑھے لکھے تو اس طرح سے نہیں کرتے ناں۔

ہم تو اپنے دوستوں کو برابر کی سطح پر ٹیٹ کرتے ہیں۔ ان کو تحفے دیتے ہیں۔ ان سے تحفے لیتے ہیں۔ ان کے ساتھ گھومتے ہیں۔ پارٹیوں پر جاتے ہیں۔ ہونٹنگ کرتے ہیں ان کی بیمار پرسی کرتے ہیں لیکن ان کی بیمار داری تو نہیں کرنے بیٹھ جاتے۔ کسی کی زچہ گیری تو نہیں کرتے۔ دوستوں رشتہ داروں کے پاؤں میں کدو تو نہیں بھسنے بیٹھ جاتے۔ اس کے لئے معاشرے نے الگ الگ شعبے قائم کئے ہیں۔ نرسیں ہیں، میٹرنی ہوم ہیں، یوٹی پارلر ہیں، مساجرز ہیں، گیٹ ویل کارڈز ہیں، ویل فیر کی خصوصی تاریں ہیں۔“

میں نے کہا ”مجھے ابھی تک دوستوں عزیزوں کو دینا گھٹنا، ان کے ہاتھ دھلانا، سر جھسنا اچھا لگتا ہے۔“

بانو نے درد مندی سے کہا ”آپ اس کام کو تھوڑی دیر تک روک نہیں سکتے۔“

”روک سکتا ہوں“ میں نے کہا ”لیکن کب تک۔“

”ہمارے بچوں کی شادیوں تک..... جب رشتے طے پا جائیں اور شادیاں ہو جائیں تو پھر شوق سے یہ کام شروع کر دیتا۔“

ہم ایک الگ کمرے میں بیٹھ کر بڑی دیر تک اس موضوع پر بات کرتے رہے۔ دلائل کے سلسلے میں بانو قدسیہ کا پلہ بھاری تھا اور میں تقریباً خاموش ہی تھا۔ وہ کہہ رہی تھی کہ میں کسی کی خدمت کرنے یا کسی کی مدد کرنے سے منع نہیں کرتی۔ لیکن ہم ادیب لوگ ہیں۔ رائٹر ہیں۔ ہمارا کام لکھنا ہے انفرادی مدد کرنا نہیں ہے..... ہمیں معاشرے کی اور حکومت کی اور

Establishment کی خرابیوں کی طرف توجہ دلانا ہے۔ ہمیں ایسے اداروں کے قیام کی تجاویز پیش کرنا ہے جو آڑے وقت میں لوگوں کی، مفلوک الحال اور دردمند لوگوں کی مدد کر سکیں۔ ہمیں اور سکول کھلوانے ہیں اور ہسپتال بنوانے ہیں۔ یہ نہیں کرنا کہ خود ہم ملے کے

الزکوں کو پڑھانے بیٹھ جائیں۔ خود اپنے عزیزوں کے ناخن کاٹنے بیٹھ جائیں۔ خود ان کی مرہم پٹی کرنے لگ جائیں۔ ہمیں صرف ذہنوں میں انقلاب لانا ہے۔ نظریات میں تبدیلی پیدا کرنی ہے۔ خود لکھنا نہیں بن جانا۔ ہاؤ!“

میں اس کی باتیں بڑے غور سے سن رہا تھا اور وہ بڑی درد مندی سے کہہ رہی تھی کہ ہمیں

ایک کر کے کٹ میں ڈالتا رہا۔ بچوں نے انہیں ٹھڈے مار مار کر ان سے کھیلنا شروع کر دیا تھا۔ دنیا کے بڑے کام اور بڑے فیصلے کچھ عجیب و غریب طریقے پر طے ہوتے ہیں۔ ان میں عقل و دانش، فلسفے اور منطق، دلیل و برہان کا کوئی دخل نہیں ہوتا۔ ان کے ساتھ کوئی تجویز یا پلٹنگ بھی نہیں ہوتی۔ جس طرح آج تک میں کسی حلقے، کسی سلسلے یا کسی رابطے میں یا اپنے نقادوں اور نکتہ دروں کے سامنے کبھی کوئی دلیل پیش نہیں کر سکا۔ نقادوں کے پوچھنے پر کہ فلاں کہانی کے فلاں کردار میں اچانک یہ تبدیلی کیوں رونما ہوئی۔ یا فلاں ڈرامے میں یہ انہونی بات کدھر سے آگئی تو مجھ سے اس کا کوئی شافی جواب نہیں بن پڑتا۔ ممتاز مفتی اور بانو قدسیہ تو بہت ہی چھوٹے انسان ہیں۔ حضرت عمرؓ جیسے جلیل القدر صحابی کو معلوم نہ ہو سکا کہ ان میں اچانک تبدیلی کیوں پیدا ہو گئی؟

یہ باتیں ہوئیں، ہو چکیں اور ہوتی رہتی ہیں۔ میرے سامنے کی باتیں ہیں۔ آنکھوں دیکھی۔ مشاہدے سے گزری لیکن میرے پاس کوئی دلیل نہیں۔ کوئی جواز نہیں۔ کوئی وضاحت نہیں۔ کسی قسم کی جوابدہی نہیں۔ اگر میں سارے زمانے کی بولیاں بولوں اور سارے الفاظ پر قدرت رکھوں اور ساری جزئیات کا سالک ٹھہروں پھر بھی میں آپ کو الفاظ سے، بیان سے، حرکات و سکنات سے، رقص سے، پینٹنگ سے چائے کاؤ اٹھ نہیں تھلا سکتا۔ چائے کے رنگ سے اس کی خوشبو سے اس کی حدت سے آشنا نہیں کر سکتا۔ شاید یہ آپ کی مجبوری نہ ہو لیکن میرا بحر ضرور ہے کہ میں علم سے اور ابلاغ سے آگاہی حاصل نہیں کر سکتا۔ وہ کچھ اور ہی شے ہے جس سے نکلنے کا اور تدبیر کا حکم دیا گیا ہے۔

اب شہاب صاحب کے آنے پر بانو قدسیہ کی اولین فکر یہ ہوتی تھی کہ سب سے پہلے ان کے ناخن کاٹے جائیں پھر ان سے چائے کے لئے پوچھا جائے۔ وہ ان سے پوچھے بغیر میری کٹ اٹھا کر لاقی تو شہاب مسکرا کر کہتے ”بانو مرتبہ ناخن تراش کی ضرورت تھوڑی ہوتی ہے۔ مینے ڈیڑھ مینے بعد ایک صحیح عمل ناخن تراش کافی سے زیادہ ہوتا ہے۔ ابھی میں آسانی سے چل لیتا ہوں، سخت بوٹ پہن لیتا ہوں، ابھی اس کی ضرورت نہیں، اگلی مرتبہ سہی“۔ لیکن بانو میری جان عذاب میں ڈالے رکھتی کہ تم ایک مرتبہ ناخن دیکھ تو لو۔ ان کا معائنہ تو کر لو شاید کوئی کونا کنارا کاٹنے کے قابل ہی ہو۔ کہیں رجتی لگانے کی ضرورت ہی ہو اور شہاب بھائی تکلف سے کام لے رہے ہوں۔ وہ شرمیلے آدمی ہیں۔ زور دے کر نہیں کہیں گے۔ مجھے مجبوراً پاؤں کا ڈاکٹری معائنہ کرنا پڑا اور پھر زبانی سرٹیفکیٹ جاری کرنا پڑا تاکہ فی الحال ضرورت نہیں۔ پندرہ سے بیس دن کے اندر اندر آپریشن ضروری ہو جائے گا۔

اپنے گھر کے ماحول کو بھی بدلنا ہو گا اور اپنے ملک کو بھی ویل فیئر سٹیٹ بنانا ہو گا۔ ہمیں تعلیم کا، صحت کا، ملازمت کا، انشورنس کا، پیدائش کا، موت کا، کفن و دفن کا سارا بوجھ معاشرے پر ڈالنا ہو گا اور کتنے گھرانے کو خاندان کو ایسی مصیبتوں سے نجات دلانا ہو گی۔ ہمیں یہ کنبہ سسٹم اور برادری سسٹم ختم کرنا ہو گا..... دیکھو ناں یہ ہمارا فرض تو نہیں کہ ہم کسی کے مڑے ہوئے ناخن کاٹنے پھریں۔ یہ تو حکومت کا فرض ہے کہ وہ ہر بڑے شہر میں پیڑی کیورنگ کلینک قائم کرے اور دکھی لوگوں کی مدد کرے۔

میں نے بانو کی یہ باتیں بڑے غور سے سنیں اور سب کو ایک ایک کر کے اپنے دل میں جگہ دی لیکن چونکہ میری بی۔ اے تک کی بیک گراؤ بنڈا بکلی دیہاتی ہے اس لئے میں بانو کی باتوں پر من و عن عمل نہ کر سکا اور ناخن کاٹنے وقت دروازے بند کر کے اور کٹنی چڑھا کر یہ عمل کرنے لگا۔

ایک روز شام کے وقت جب میں دروازہ بھیڑ کر شہاب کے ناخن کاٹ رہا تھا تو دھڑاک سے دروازہ کھلا اور بانو قدسیہ کی قیادت میں میرے بڑے بھائی، میری بھابی، ان کے دونوں بیٹے، بیٹوں کی بیویاں اور ان کے ساتھ ان کے بچے ایک بجوم کی شکل میں اندر داخل ہوئے۔ میں کٹنی لگانی بھول گیا تھا۔ شہاب نے کھینا سا ہاتھ اٹھا کر میرے بھائی سے مصافحہ کیا۔

میں نے نگاہیں اوپر اٹھائے بغیر اپنی بھابی سے کہا ”اس کے ناخن اندر کو مڑ جاتے ہیں اور گوشت میں پوسٹ ہو کر خون نکال دیتے ہیں تو بڑی تکلیف ہوتی ہے۔ میں ذرا ذرا اس کی مدد کر دیتا ہوں۔“ لیکن میرے ارد گرد پوری کٹ کھلی ہوئی تھی۔ اس میں ناخن کاٹنے والے اوزاروں کے علاوہ چھوٹی بڑی گول ریتیاں، چوسے، نمرنے، لوشن، کریمیں، سیولون، ڈیٹل، آئٹ منٹ کی ٹیوپی، محدث شیشے اور گھڑی ساز کا آنکھ کو لگا کر دیکھنے والا شیشہ بھی موجود تھا۔ بھائی جان کی ایک ہونے شرارت سے مسکرا کر کہا ”چچا! یہ ذرا ذرا والی مدد ہے! اتنا سامان تو فننگ یا بنگ بیوٹی پارلر میں بھی نہیں ہوتا۔“

بانو نے کہا ”ابھی دو چیزیں کم ہیں۔ وہ آجائیں گی تو شہاب بھائی کو اور بھی آسانی ہو جائے گی۔ ابھی جب ہم کچھی پر ناخن کا کونہ اٹھاتے ہیں تو ان کو بڑی تکلیف ہوتی ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ ان کو ذرا ابھی تکلیف نہ ہو۔“

شہاب بہت مدہم، بہت دھیمے، بہت جھینپو آدمی تھے۔ چور سے بنے صوفے پر بیٹھے رہے۔ میرا ساگر اگھر ان کے گرد گھیرا ڈال کر کھڑا رہا اور میں قالین پر پھیلی ہوئی چیزیں ایک

معالج کے ہاتھوں میں مریض ایک عجیب طرح کا قیدی ہوتا ہے۔ وہ خود تو ممنون احسان ہوتا ہی ہے اس کے عزیز واقارب، دوست، رشتہ دار، ملاقاتی اور لواحقین بھی معالج سے مرعوب ہو کر اس کے سامنے گھٹکھینچنے سے لگتے ہیں۔ میں بیٹھتا تو اس کے پاؤں میں تھا لیکن میری ہنرمندی کی بنا پر شہاب کا سارا خویش قبیلہ میرا شکر گزار تھا اور ان کے یہاں میرا قیام بالکل ایسا ہوتا جیسے نواب بھوپال کے یہاں حکیم اجل خان کا ہوتا تھا۔

ایک روز اپنے بھانجے بھتیجوں کو میری خدمت میں مصروف پا کر اور اپنی ہمشیرہ کو میرے لئے خصوصی کافی بنا کر لاتے دیکھ کر اس نے اپنی مخصوص دھیمی آواز میں کہا ”بڑی لمبی لمبی دوستیاں دور تک کم ہی چلا کرتی ہیں۔“

میں نے کہا ”نہیں..... ضروری نہیں..... چل بھی جاتی ہیں۔“

اس نے اپنے قریبی حلقے میں سے دو بگڑی یاروں کا نام لے کر کہا ”اب دیکھو ان کی دوستی بھی تو چالیس پینتالیس سال پرانی تھی۔“

”تھی،“ کا کیا مطلب ”میں نے چونک کر پوچھا۔“

”تھی کا یہ مطلب“ اس کی آنکھیں شرارت سے جھمکائے لگیں ”کہ اب ان میں دوستی کا رشتہ باقی نہیں رہا اور انہوں نے ایک دوسرے سے بولنا بند کر دیا ہے۔“

”لیکن چند روز پہلے تو میں نے ایک ویسے پرانے دیکھا تھا۔“

”اس میں تم تھوڑی سی غلطی کر گئے ہو“ شہاب نے لہرا کر کہا۔

”تمہارے اس فقرے میں انکسے کا لفظ بے جا استعمال ہوا ہے اور بیان میں ذرا سا کستہ

پڑ گیا ہے۔ وہ دونوں ویسے پر موجود ضرور تھے لیکن انکسے نہیں تھے۔“

میں نے کہا ”یہ کس طرح سے ہو سکتا ہے۔ وہ ایک ہی میز پر بیٹھیں جوڑ کر ایک ہی انداز میں اونچی چوٹی والی بریانی کھا رہے تھے اور اونچے اونچے بول رہے تھے۔“

”آپس میں؟“ اس نے پوچھا۔

میں نے کہا ”نہیں آپس میں تو نہیں دوسرے دوستوں سے بول رہے تھے جو سامنے

کھڑے تھے۔“

”تمہیں ان کی گفتگو کا مضمون یاد ہے؟“ شہاب نے پوچھا۔

میں نے کہا ”کچھ بکھرے بکھرے سے مضمون تھے کچھ ہلکی ہلکی سی بکاریں تھیں۔ میں

نے کوئی خاص توجہ نہیں دی۔“

”وہ جو بکھرے بکھرے سے مضمون تھے نا“ شہاب نے کہا ”وہ سامنے دوستوں کے

لئے نہیں تھے بیٹھے پیچھے کھڑے یا ر قدیم کے لئے طنز کے تازیانے تھے۔ اب وہ باقاعدگی سے ہر محفل میں جاتے ہیں اور ایک دوسرے کو سب کے سامنے ضرب شلاق کرتے ہیں۔“

میرامنہ حیرت سے کھلا رہ گیا اور مجھے شہاب کی بات کا یقین نہ آیا۔ پھر اس نے میز کی دراز میں سے ان میں سے ایک دوست کا خط نکالا اور میری طرف پھینکتے ہوئے بولا ”اس نے حال ہی میں سو فٹ کا فینٹہ خریدا ہے۔“

”فینٹہ؟“ میں نے اور حیرت سے پوچھا۔

تو شہاب کہنے لگا ”دوسرے دوست کو حال ہی میں سرکار کی طرف سے ایک پلاٹ ملا ہے اور وہ اس پر اپنی کوٹھی بنوا رہا ہے۔ آج رات کے وقت فینٹے والا دوست اپنی کار میں بیٹھ کر اس کے پلاٹ پر پہنچتا ہے اور اس کے پلاٹ کو ناپتا ہے اور پھر بلبلہا کر کہتا ہے۔ حرام زادے پٹھو کو ایک سو ساٹھ فٹ فرنٹ کا پلاٹ ملا ہے۔ کیوں نہ ملے دو دو ٹکے کے افسروں کی خوشامد جو کرتا رہا ہے۔ ان کی جوتیاں جو جھاڑتا رہا ہے اور ان کے بچوں کے منہ جو پونچھتا رہا ہے۔“

پھر وہ پلاٹ کے اندر اٹھتی ہوئی دیواروں کی لمبائی چوڑائی اور موٹائی کا ماپ لیتا ہے اور گا گا کر کہتا ہے ”باپ پھتو کھمار، بیٹا مغل شمسوار، ایک ایک فٹ کا سارا اسار۔“

نواجی کی نہیں کوئی دیوار، اور ایک آدھ گھنٹہ لگا کر، سارے Dimensions نوٹ بک میں لکھ کر واپس گھر چلا جاتا ہے۔“

میں نے کہا ”تمہیں کیسے معلوم ہے؟“

”مجھے جو کیدار نے بتایا ہے جو پلاٹ کی نگرانی پر مامور ہے۔“

میں نے کہا ”کب گیا تھا فینٹہ ٹیپ لے کر؟“

کہنے لگا ”کب کیا بھائی۔ ہر رات جاتا ہے اور ہر رات ناپ لے کر آتا ہے۔ البتہ اپنے گانے میں مغفلات کا اضافہ کرتا رہتا ہے۔ اب تو اس کی ہزلیات جو کیدار کو بھی یاد ہو گئی ہیں۔“

میرے لئے یہ ایک انوکھی اور ان ہونی بات تھی۔ اور مجھے اس پر یقین نہیں آ رہا تھا۔

اصل میں شہاب کا واقعہ تو ہمیشہ سچا ہوتا تھا لیکن اپنے بیان میں وہ مبالغہ آرائی ضرور کرتا تھا۔

تصویر تو ٹھیک ہوتی تھی لیکن وہ اسے فریم کے بغیر آویزاں نہیں کرتا تھا۔ میں اس کے ان دونوں

دوستوں سے بہت اچھی طرح سے واقف تھا بلکہ میں نے ان کی مثالی دوستی کو شہاب سے بھی

زیادہ قریب سے دیکھا تھا۔ ان کی پچاس سالہ قدیم دوستی اس قدر گہری تھی کہ وہ اپنی کوئی

بات، کوئی راز، حتیٰ کہ اپنا کوئی عضو بھی دوسرے سے پوشیدہ نہ رکھتے تھے۔ دوسرے کے وقت وہ

دوسرے کے قریب خود اس قدر قریب سے دیکھا تھا۔

میں نے کہا ”جب دوستی دشمنی میں اور رشتے داری شریکے میں تبدیل ہو جائے تو پھر میں یہ خدمت کیسے سرانجام دے سکتا ہوں۔“

میں نے کہا ”شباب صاحب یہ ذرا مشکل کام ہے۔ میں مفتی صاحب کا تربیت یافتہ پشما ہوں اور ان کا اصول ہے کہ جب کسی سے توڑ دی تو پھر توڑ دی۔ دوبارہ تعلق پیدا نہیں کرنا۔ شاید میرے لئے یہ ناممکن ہو جائے کہ اصل میں تو ہماری بول چال بند ہے اور میں ناخن کاٹنے کے لئے باقاعدگی سے آپ کو مل رہا ہوں۔“

اس نے منہ بھر کے ایسی بیماری کا نام لے دیا کہ میرے پاؤں تلے کی زمین نکل گئی۔
میں نے ان کا کندھا چھتہ پکار کر بڑے مربیانہ انداز میں کہا ”فکر نہ کرو۔ ویسے ہی ہو گا جیسے تم
کہتے ہو۔“

میرے دل میں بیٹھے بیٹھے یہ تمنا کئی مرتبہ پیدا ہوئی کہ میرے اور شہاب کے درمیان

فیض صاحب کا گھر ریڈیو شیشن کے عین سامنے تھا۔ وہ بھی میری طرح تیز دھوپ میں پیدل چل کر آئے تھے اور ان کے تہمتے ہوئے کالوں پر پسینے کے موٹے موٹے قطرے پیچھے سے آئے والے کسی اور موٹے قطرے کے انتظار میں کھڑے تھے، انہوں نے داخل ہوتے ہی اپنے مخصوص لمبے میں کہا ”جی تم سے ایک مشورہ کرنا تھا کیونکہ ہم کو تو ان قانونی باریکیوں کی سمجھ نہیں ہے.....“ اور پھر جب دھوپ میں چند ہیائی ہوئی آنکھیں کمرے کی روشنی سے مانوس ہوئیں تو فیض صاحب نے انہیں آواز میں لاجول والاقوۃ الالبانہ پڑھا اور نعوذ باللہ، نعوذ باللہ کہتے ہوئے وہاں سے بھاگے۔

ان دونوں دوستوں نے مل کر زور کاغزوہ مارا اور کہا ”بھاگ گیا ملا بھاگ گیا مولانا۔۔۔ اپنی عربی شریف ساتھ لے کر“ مجھے بھی مجبوراً ان کے ساتھ مل کر ہنستا پڑا کیونکہ وہ بار بار مجھے منافقت اتار دینے کو کہتے تھے اور میں بار بار یہی کہہ رہا تھا کہ اگلی مرتبہ آیا تو تیار دوں گا۔

مجھے یقین نہیں آ رہا تھا کہ ان دوستوں کے درمیان تفرقہ پڑ گیا ہے جن کو میں نے ایک

دشمنی کی گہری خلیج پیدا ہو گئی ہے۔ میں نے اس کے خلاف خطبہ طور پر کئی خطا اخباروں میں چھپوائے ہیں اور صحافی دوستوں سے مل کر اس کے خلاف کالم بھی لکوائے ہیں۔ اس کے وہ خط بھی جید نقادوں کے حوالے کر دیئے جو اس نے مجھے لکھے تھے اور جن میں ایام جوانی کے فحش جملے بھی بار بار آتے تھے۔ اس نے بھی میرے منظر کو ایک ڈی۔ او لکھ کر مجھے نوکری سے نکالوانے کی کوشش کی۔ میری منشری سے کہا کہ ذرا اس بات کی تحقیق تو کریں کہ یہ شخص ہر حکومت میں بدستور اسی نوکری پر چلا آ رہا ہے اور اس کی ملازمت ختم نہیں ہوتی ہے۔ اس اثناء میں مجھے اس کا پیغام ملتا ہے کہ ”اب چلنے پھرنے سے معذور ہو گیا ہوں۔ کل لاہور آ کر ناخن کٹوانے چاہتا ہوں۔ تم کہیں چلنے نہ جانا۔“ میں جواب بھجواتا ہوں کہ کل نہ آنا۔ پرسوں آ جانا۔ کل مجھے ایک ضروری کام ہے۔ اور ضروری کام (جس کا میں اسے علم ہونے نہیں دیتا) یہ ہے کہ مجھے انکم ٹیکس والوں کو اس کے اس بنگا کاؤنٹ کا نمبر فراہم کرنا ہے جس کا اس نے اپنی انکم سیٹ منٹ میں آج تک ذکر ہی نہیں کیا۔

وقت مقررہ پر شہاب آتا ہے۔ میں انٹرکون کے کمرہ نمبر ۲۲۴ میں جا کر اپنے اوزار نکالتا ہوں۔ وہ سلام کرتا ہے۔ میں اس کا جواب نہیں دیتا۔ وہ پاؤں آگے پھیلا دیتا ہے۔ میں اسی توجہ اور اسی انہماک سے اس کے ناخن کاٹتا ہوں۔ وہ ہتھینک پوکتا ہے۔ میں اس کا جواب نہیں دیتا۔ وہ مجھے لفٹ تک چھوڑنے آتا ہے۔ میں پیچھے مڑ کر نہیں دیکھتا۔ وہ کمرے میں واپس جا کر اپنے ناخنوں کو دیکھتا ہے اور خوش ہوتا ہے کہ اچھا ایک آدمی کو الونایا ہے۔ میں دفنوں میں جا کر پرانے رجسٹر دیکھتا ہوں کہ مسمیٰ قدرت اللہ شہاب کو کسی وقت کوئی ”ٹوٹا اراضی“ تو لاث نہیں ہوا۔

لیکن میری یہ تمنا پوری نہ ہو سکی اور شاید اس کی خواہش بھی پہنچ ہی میں رہ گئی اور ہم دونوں کے خواب چکناچور ہو گئے۔

ایک مرتبہ شام کے وقت شہاب صاحب نے اسلام آباد سے فون کر کے کہا ”بانو! میرے ناخنوں کی تکلیف بڑھ گئی ہے۔ آسانی سے چل پھر نہیں سکتا۔ مسجد بھی نہیں جاتا۔ صرف جرابیں پہن کر بیٹھا رہتا ہوں۔ تم خلیفہ کو ایک دن کے لئے بھیج دو کہ آکر میرے ناخن کاٹ جائے۔“

میں رات کو دیر گئے گھر واپس آیا تو بانو قدسیہ ابھی جاگ رہی تھی۔ اس نے شہاب خان کو فون کر کے میرا اسلام آباد کا نمٹ بھی بخوالیا تھا۔ میرا ایک بھی تیار کر دیا تھا اور اشیر خان کے سرہانے الارم لگا کر گھڑی بھی رکھ دی تھی کہ صبح اٹھ کر مجھے ایہ پورٹ چھوڑ آئے۔

اگلی مرتبہ جب شہاب صاحب لاہور آئے تو بانو نے اپنے بچوں کو ان کے پاس کھڑا کر کے اور ان کے چہرے ان کی طرف اٹھوا کے کہا ”شہاب بھائی! اس وقت ہم سب کے سامنے وہ اعلان کریں جو آپ نے اسلام آباد سے فون پر کیا تھا۔“

انہوں نے شربا کر سر جھکا لیا اور خاموش ہو گئے۔ بانو نے دو تین مرتبہ بڑی بینتی کے ساتھ اصرار کیا تو انہوں نے کچے پڑ کر بڑے دھیمے لہجے میں کہا ”میں نے یہ کہا تھا اشفاق احمد میرا خلیفہ ہے۔ میرے خلیفہ کو ایک دن کے لئے میرے پاس بھیج دو۔“ پھر انہوں نے ذرا رک کر کہا

”میں اس کے لئے اور اس کے گھرانے کے لئے دعا کرتا ہوں اور اللہ تعالیٰ سے عرض کرتا ہوں کہ وہ اس گھرانے کو خیر کثیر عطا فرمائے۔“

بانو قدسیہ خوشی سے لبریز ہو کر تسکیاں بھر کر رونے لگی اور اس کے چہرے سے ساری کلفتیں اور ساری بیماریاں ایک ساتھ دور ہو گئیں۔

تینیس جولائی کو ان کی بھانجی گڈی نے فون پر مجھے اطلاع دی کہ ”ماموں جی اچھی طرح سے چل پھر نہیں سکتے۔ آپ جلدی سے آجائیں۔“

میں اوزاروں کو اچھی طرح سے ابال کے اور پھر سیولون میں لتھڑ کر نئے لوش بنانے لگا۔ شاہد خاں نے آکر بتایا کہ جہاز میں کوئی سیٹ نہیں ہے۔ ریکوسٹ پر بھی اٹھا رہا ہوں نمبر ہے، اس لئے آپ گاڑی پر ہی جائیں اور صبح ہی صبح روانہ ہوں۔

میں صبح ہی صبح گاڑی پر نکل گیا تو اسلام آباد میں شہاب کے گھر کے گیٹ پر لوگوں کا بڑا مجمع تھا۔ لان پر ایک بڑا سا تنبوتنا تھا۔ کچھ لوگ کھڑے تھے۔ کچھ بیٹھے تھے۔ کچھ موٹروں سے نکل رہے تھے۔

گڈی نے آکر مجھ سے پلٹتے ہوئے کہا ”آؤ چچا آپ کو ماموں جی کے پاس لے چلوں۔ اپنے کمرے میں ہی ہیں اور لیٹے ہوئے ہیں۔“

میں اپنے اوزاروں کی کٹ لے کر اس کے پاؤں کے پاس کھڑا تھا اور میرا اور اس کا معاہدہ تھا کہ جب ہم ایک دوسرے سے ناراض بھی ہو جائیں اور ہمارے درمیان تفرقہ بھی پیدا ہو جائے اور ہم ایک دوسرے کے دشمن بھی بن جائیں، پھر بھی میں اس کا خلیفہ ہی رہوں گا اور اس کے ناخن اسی طرح سے کاٹتا رہوں گا جیسے اب تک کاٹا آیا ہوں۔

میں نے اپنی کٹ اوپر اٹھا کر کہا ”ناخن کٹاؤ“

لیکن وہ بولا نہیں

میں نے پھر کہا ”ناخن نہیں کٹوانے تو کم از کم ان کے کونوں پر جی ہی لگوا لو“۔

لیکن اس نے میری اس بات کا کبھی کوئی جواب نہیں دیا..... میں نے اپنے اوزار اس کے کمرے میں رکھ دیئے اور باہر آکر شامیانے تلے بیٹھ گیا جہاں لوگ آہستہ آہستہ جمع ہو رہے تھے۔

اس مضمون کو پڑھ کر آپ کو خود ہی اندازہ ہو گیا ہو گا کہ اشفاق کے دل میں شہاب بھائی کے لئے کیسی، کتنی اور کس طرز کی محبت تھی۔ لیکن میں آج تک ان دونوں کے رابطے کو سمجھ نہیں سکی۔

ایک جانا مفتی جی کا ہوتا ہے کہ افام و تنفیم کے بغیر رشتہ مضبوط نہیں ہوتا۔ ایک جان کاری خان صاحب کی ہے جیسے خوشبو کے تقاب میں حیات پر تکیہ کر کے آدمی محبوب کے حضور پہنچ جائے اور ایک میرا طریقہ ہے میں ہمدردی کا ہار پون مار کر گرفتار کرتی ہوں۔ سدرشن چکر چلاتی ہوں اور نرنے میں لے کر دوسرے کو جانتی ہوں۔ رات کے دس بجے جب انسان تھکا ہارا اور غمگین ہوتا ہے اس کے اعضاء اپنے راز چھوڑنے لگتے ہیں چپتے کی طرح میرا حملہ ہوتا ہے۔ کسی کو جاننے کا میرا یہی نسخہ ہے کہ آپ اس کے راز جانیں۔ اس سے اتنی ہم نفسی کریں کہ نہ صرف وہ شخص آپ کے سامنے بے نقاب ہو جائے بلکہ اس کی روح بھی آپ کے سامنے سینہ پینٹی رہ نہ ہو۔ ایسے میں جس سے میں واقفیت حاصل کرنا چاہتی ہوں اس کا اور میرا ایک معکوس رابطہ بن جاتا ہے۔ ہمدردی چاہنے والا میرے جال میں مڑی کی طرح پھنس جاتا ہے۔ وہ مجھ پر اس قدر Dependent ہو جاتا ہے کہ اس کے شب و روز میرے بغیر کئے محال ہو جاتے ہیں۔ ہم صغیری چاہنے والے کی یہی معذوری، مجبوری میری روح کی غذا، میری مانتا کا پیشہ اور میری انان کی کھوٹی ہے۔

شہاب بھائی کو ہم مرکزی کی ضرورت نہ تھی وہ اپنی آزادی سے اتنی محبت کرتے تھے کہ پوڈل بنانا ان کے لئے محال تھا۔ اسی لئے نہ وہ کسی کے راز معلوم کرتے..... نہ کسی کے راز اگلو کر انہیں خوشی ہوتی۔ کوئی ان کے سامنے بیٹھ کر روتا ہے وہ بغیر وجہ معلوم کے ہمدردی کئے جاتے وہ خط ماس کی طرح محض قطر پر رہ کر مدد کر سکتے تھے۔ انہیں کسی کی رسی پکڑنے، کسی کو دست نگر بنانے یا اپنے سے ہلکا ثابت کرنے کی ضرورت نہ تھی۔ سرکاری دفاتروں میں جہاں جہاں وہ کسی کی مدد کر سکے انہوں نے لکھا کیو بیو شہاب اور مدد کر دی..... جب کبھی کسی کو رقم کی ضرورت ہوتی انہوں نے منی آڈر پر لکھا کیو۔ یو شہاب اور رقم بھیج دی..... کسی کے مرگ ہو گئی تو وہ کیو۔ یو شہاب کو چھپا کر ساتھ لے گئے تاکہ مرنے والے کی سادھ کم نہ ہو جائے۔ عیادت کو گئے تو کیو بیو شہاب کو گھر چھوڑ گئے تاکہ مرلیض کی شخ خراش نہ کرے۔ شادی کے ہنگامے میں شامل ہونے تو کسی کو نے میں بیٹھ کر کسی انجانے شخص کے حوالے کیو۔ یو شہاب کو کر دیا مبادا اسے انظر میں کرنے کا بوجھ گھروالوں کے ذمے ہو جائے۔ دوستوں میں بیٹھ کر کیو بیو شہاب کو کھلا چھوڑ دیا تاکہ دوستوں کی حیضات طبع کے لیے وہ اپنے سفروں کی داستان، نوکری کی رد واد، بچپن کے واقعات

بٹانے..... نو جوانوں کو کیو بیو شہاب نے کبھی خوفزدہ نہیں کیا۔ نوکر بھی اس بڑے صاحب سے ڈرے نہیں۔ نادار بیکس عورتوں کو معلوم ہی نہ ہو سکا کہ کیو بیو شہاب ایک ایسا افسر ہے جس سے خوفزدہ ہونا چاہئے۔ یہ سب اس لئے کہ خود آزاد رہ کر وہ کسی کی خود مختاری سلب نہیں کرتے تھے شہاب بھائی کسی کے دل میں بڑھی اتار کر اترا ہی نہ چاہتے تھے کیونکہ اترنے کے بعد قیام کرنے کی بھی ایک شرط ہوتی ہے اور وہ یہ شرط اس لئے پوری نہ کر سکتے تھے کیونکہ انہیں اپنی آزادی بہت پیاری تھی۔

چونکہ مجھے اپنی تکنیک سے شہاب بھائی سے واقفیت حاصل نہ ہو سکی اس لئے میں نے غور سے ان کی عادات کا جائزہ لینا شروع کر دیا۔ اس میں کچھ مفتی جی کا اصرار بھی شامل تھا۔ وہ کہا کرتے۔

”میں شہاب بھائی کو تم بھی کوشش کرو..... وہ کیا سوچتا ہے؟ کیا چاہتا ہے؟ اس کی نیت کیا ہے؟“ میں شہاب بھائی کو نہ کر سکی لیکن میرا فوکس ان کی طرف ضرور ہو گیا۔

دیے بھی شہاب بھائی سے ہمدردی کرنے کی کوئی وجہ نہ تھی اس لئے میں ان کو صرف دن کی روٹین کے حوالے سے جاننے لگی، صبح ناشتے کے وقت میں انہیں پر اٹھا پکا کر دیتی۔ اور یہ معمول ان تک ہلکی پھلکی گتنگو اور چھوٹی سی رسائی کا باعث بنتا رہا۔

شہاب بھائی ایک مدت سے بہت ہلکا ناشتہ کرنے کے علاوہ کچھ لیکن میری طبیعت میں کھلانے پلانے کا اصرار بہت ہے۔ میں اپنے مہمان کو بے طور زچ کرنے کی عادی ہوں۔ شاید محفل میں نمایاں ہونے کی مجھے اس سے اچھی کوئی ترکیب نہیں آتی۔ کسی کو زیر بار کرنے کا اس سے مناسب طریقہ بھی مجھے نہیں آتا۔ اصرار ہی اصرار..... نمائش ہی نمائش..... انا..... دکھلاوا ہی دکھلاوا انا ہی انا۔ کبھی بھونڈی شکل میں کبھی بڑے شاندار انداز میں..... لیکن ہمیشہ ہمدردی کے ہار پون کے ساتھ.....

ہلکی مرتبہ جب میں نے شہاب بھائی کے لئے پراٹھا پکایا..... اسے شہد اور ملائی کے ساتھ سامنے رکھا تو وہ بولے سے کسمسمائے، دونوں ہاتھ اٹھائے اور آہستہ سے بولے ”یہ تو بہت زیادہ ہے..... لیکن جب میری مانتا کا گوار بھانا چڑھتا ہے تو معقول اور نامعقول دونوں کو بہالے جاتا ہے۔

میں نے تنجاہل عارفانہ سے کہا..... ”یہ زیادہ ہے جی؟..... میں ایک چھوٹا سا پکا دیتی ہوں.....“ ”ناں ناں..... بالکل ٹھیک ہے لیکن آپ اور نہ پکائیں میں اور خان صاحب شیئر کر لیں گے۔“ لیکن میں کسی کو کب شیئر کرنے دیتی ہوں؟ اس طرح تو وہ توجہ بھی شیئر ہو جاتی ہے جس پر صرف میرا حق ہوتا ہے۔ میری انا صرف آدھے کورے کی طرح اٹھ نہیں سکتی۔

”نہیں شہاب بھائی..... ان کے لئے تو بے پروا ہے.....“

شہاب بھائی کسی کا عمل ضائع نہیں کرتے تھے اگر وہ ٹھنڈا پانی مانگتے تو تین آدمی پانی کے رخ گلاس لے آتے تو وہ تینوں گلاس رکھ لیتے اور آہستہ آہستہ تینوں گلاسوں میں سے کچھ اس طرح پیتے کہ اگر خالی ہوتے تو

تینوں اور اگر بھرے رہتے تو تینوں ایک ہی سطح تک۔

پرائیوٹ کاناٹھ کرتے کرتے ایک دن انہوں نے کہا..... ”ماں جی اور میں جب جھنگ میں تھے تو وہاں ہم نے ایک بھینس پال رکھی تھی۔ میں صبح پراٹھے کے ساتھ مکھن کھایا کرتا تھا..... رفتہ رفتہ میری گردن غائب ہو گئی، کندھے اور سر آپس میں جڑ گئے۔ اور میں بالکل چورس نظر آنے لگا۔“

جب آخری مرتبہ وہ داستان سرائے آئے تو صبح کے وقت دو ایوں کی گولیاں نیلی ڈبیا سے نکال کر کواڑ پھیر پر رکھتے ہوئے انہوں نے کہا ”بس یہ میں آخری مرتبہ آپ کے گھر کچھ پکا ہوا کھارہا ہوں.....“

میں نے چونک کر پرائیوٹ پر چھوڑ دیا اور خاں صاحب ازلی خاموشی کا شکار ہو گئے۔ ”کیوں شباب بھائی؟ کیوں؟؟؟“

انہوں نے ہماری تشویش بھانپ کر کہا..... ”نہیں بات کچھ خاص نہیں ہے جب پچاس کی عمر آگے تھو سال کوئی نہ کوئی مرغوب غذا چھوڑ دیں چاہئے۔ میں اب دوبارہ جب آیا تو کوئی بچی ہوئی چیز نہیں کھاؤں گا۔ صرف پھل۔“

اس روز مجھے خوف لاگو ہوا کہ شاید..... شور بہہ بنزیاں، خشخاش، کچھڑی کھانے والا اب ہم میں نہیں رہے گا لیکن وہ اتنے انہماک سے لندن جانے کا پروگرام بناتے رہے کہ یہ ہلکا سا خوف بھی جلد جاتا رہا۔

شباب بھائی کو پھل بہت پسند تھے۔ وہ چائے کی پیالی پینے سے پہلے خربوزہ، آم، سیب جو بھی موسم کا ہو ہوتا کھانا پسند کرتے..... لیکن اگر پھل موجود نہ ہوتا تو نہ تقاضا کرتے نہ اس کے متعلق کوئی سوال کیا جاتا۔ ایک روز کہنے لگے..... ”جب میں نے نیا نیا آئی سی ایس پاس کیا اور لندن گیا تو وہاں جاکر مجھے پتہ چلا کہ انگریز چائے پر پھل ضرور کھاتا ہے اس لئے میں نے پورا آئی سی ایس بننے کے لئے پھل کھانے کی عادت ڈال لی ہے.....“

غالباً یہ ایک پردہ تھا..... جو وہ اپنے معمولات چھپانے کے لئے کیا کرتے۔ اللہ نے دنیاوی اور دینی نعمتوں کے دروازے ان پر کھول رکھے تھے اور وہ جانتے تھے کہ اللہ جس کو چاہے نوازے، جس کو چاہے راندہ درگاہ کر دے..... سب کچھ توفیق سے ملتا ہے لیکن وہ اپنی عہدیت قائم رکھنے کے لئے بڑی کڑی مشقت کرتے بری ساری رات عبادات میں گزارنا ان کے لئے معمولی بات تھی۔ اسی لئے وہ پھل، ٹھنڈے مشروبات، بخ بست پانی، شکجین، بڑے شوق سے پیتے تھے۔ ان کے سارے جسم میں اللہ کے نام کی بھڑکی لگی ہوئی تھی اسے ٹھنڈا کرنے کے لئے وہ آہستہ چلتے، ٹھنڈی میٹھی گفتگو کرتے اور بخ پانی پیتے۔

شباب بھائی ہر معاملے میں اعتدال کو پسند کرتے تھے..... کھانے پینے میں مسر کی دال کی کچھڑی، خشخاش، بنزیاں، پھل شوق سے کھاتے۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ انہیں گوشت ناپسند تھا..... بلکہ وہ سمجھتے کہ جو کچھ ان کے سامنے لگا دیا وہی پسندیدہ ہو گیا۔ نمک زیادہ ہوا تو وہ بولے نہیں۔ کم ہوا تو انہوں نے مانگا نہیں۔ میں نے انہیں نمک دانی سے چھڑک کر کسی سالن پر نمک ڈالتے ہوئے نہیں دیکھا۔ صرف ایک چیز میں

اپنی پسند کا اصرار کیا کرتے تھے وہ بھی بہت لجاجت اور منت کے ساتھ کہتے..... ”ٹھنڈا پانی.....“ اگر برف کوٹ کر بھی گلاس میں دے دی جاتی تو وہ اسے خوشی سے پیتے..... اور اگر پلانے والا ٹکڑے کا پانی لے آتا تو وہ بھی آرام سے پی جاتے..... نہ کوئی شکایت کرتے نہ برف منگواتے۔ انہوں نے کبھی بھڑکیلے رنگ استعمال نہیں کئے۔ لیکن ایک ارغوانی مائل سرخ ڈرننگ گاؤن ایسا بھی ان کے پاس تھا جسے وہ بڑے اہتمام کے ساتھ پن کر ہم سب میں بٹھا کرتے۔ شباب بھائی کی نوکری، زندگی اور نفاست پسندی کا تقاضا تھا کہ وہ خوش لباس رہتے۔ لیکن لباس کے متعلق انہوں نے کبھی تلاش اور گفتگو نہیں کی۔

مجھے ایک واقعہ یاد آگیا۔ اقبال سنٹینز می کے سلسلے میں کچھ تقریبات لاہور میں ہو رہی تھیں۔ انہی تقریبات میں شرکت کے لئے مرحوم اسکندر باؤ سانی بھی روم سے پاکستان آئے ہوئے تھے اور انشائی بھی موجود تھے۔ ان تقریبات پر صبح تیاری کا گرما گرم مرحلہ ہوتا۔ سب تیاری میں مصروف نظر آتے۔ شباب بھائی اپنے کپڑے پولے پولے ہاتھوں سے اٹھاتے باہر آتے اور بڑی انکساری سے کہتے..... ”یہ ذرا کوٹ کے کالر کو پچھلی طرف سے استری کرادیں تاکہ بہت زیادہ اکڑا ہوا محسوس نہ ہو.....“

زیادہ کلف، جمی ہوئی استری والے کپڑے، بیگروں میں ٹنگے ٹنگائے، ڈرائی کلیئر سے لوٹے ہوئے، کھڑکتے لفافے، خوشبو کے بھجھا کے اڑاتے، ایسے کپڑے جن سے تیاری، خود آرائی، اور خود پسندی کا گماں ہو کبھی ان کے ساتھ نہ ہوئے۔ وہ ایک انگریز صاحب کی طرح بڑا نفیس لباس پہنتے ان کے جوتے آرام دہ ہوتے تائیاں، جرائیں، رومال، دستانے قیمتی اور لباس کے مطابق نظر آتے لیکن ان چیزوں سے کوئی ٹھٹھاتی ظاہر نہ ہوتی۔ کسی کو مرعوب کرنا، خود اپنی ذات کو نمایاں کرنا مقصود نہ ہوتا۔ دس بارہ سال پہلے انہوں نے شلوار قمیض پہننا شروع کیا۔ ریٹائرمنٹ کے بعد صبح سیر کے بعد وہ کریب سول کے جوتے شرٹ اور پیٹنٹ اتار دیتے اور سارا دن شلوار قمیض میں ہی بسر کرتے۔ لیکن نہ تو نفیس لباس وچہ عزت تھا۔ نہ شلوار قمیض کی سادگی سے مراد فقیری کا اظہار تھا۔ شباب صاحب کی ذات کو کاغذ پر لانا اس لئے مشکل ہے کہ وہ کچھ بھی کسی کو دکھانے کی خاطر نہیں کرتے تھے۔ وہ مکمل طور پر اپنے اندر اپنی نیت کے تابع تھے اور وہ اس کمپیس کو کسی صورت بھی غلط کرنے کو تیار نہ تھے..... کھانے پینے کی طرح کچھ لباس، کچھ رنگ، کچھ شائل انہیں بھی پسند تھے لیکن ان کی تلاش میں ان کے اصرار میں ان کی زندگی نہیں گزرتی تھی۔ پسند کا کپڑا ہاتھ آگیا وہ پسند لیا..... ورنہ جو میسر آیا وہی پسندیدہ ہو گیا اتنی ٹرننگ کے باوجود عموماً وہ کما کرتے..... ”اس بار میں اپنا Conduct درست کر کے آؤں گا۔“

سردیوں کا موسم تھا۔ شباب بھائی اپنا سرخی مائل میرون ڈرننگ گاؤن پہنے بیٹھے تھے اور انہیں سردی لگ رہی تھی۔ اشیر خاں نے بھانپ کر کہا..... ”شباب چچا! میں اپنا سوئٹر لا دوں؟“

”ہاں لا دو..... لیکن تم ہماری ایچ پر زیادہ سوٹ کرنے والا نہ ہو.....“

اشیر خاں ایک بچھا بچھا سا ہلکا نیلے رنگ کا سوئٹر لے آئے۔ شباب بھائی نے اسے آرام سے پن لیا لیکن

مرکزی اردو بورڈ بعد میں اردو سائنس بورڈ ہو گیا ، بیس پر شہاب بھائی دوپہر کے وقت خان صاحب کے ساتھ ملا اور روٹی کھاتے اور بڑی تعریف کرتے۔

”یار پاکستان میں یہ لٹچ رائج ہونا چاہئے..... تھوڑا سا کچور اور روٹی۔ لیکن اس میں ایک قباحت ہے..... یہ ہضم بہت جلد ہو جاتا ہے.....“

عموماً شہاب بھائی اور خان صاحب عصر کی نماز سے کچھ پہلے گھر آتے۔ بڑے پھانک کو کھول کر جب وہ اندر داخل ہوتے تو بڑی دلچسپی سے گھر والوں کو اپنے گزارے ہوئے دن میں شامل کر لیتے..... ”آج صبح اشفاق سے دوا لیے آدمی ملنے آئے جو Pain in the neck تھے اس کے لئے..... لیکن میرا وقت اچھا گزارا..... پھر میں نے خالد ہری اور بیڈی کو خط لکھا۔ دوپہر کو ہم دونوں بیڈن روٹ گئے اور ڈرائی فروٹ خریدا۔ لیکن اشفاق نے کاجو اور بادام زیادہ خو کھائے اور مجھے کم دیئے..... مونگ پھلی اس نے کم کھائی اور مجھے زیادہ کھلائی..... ابھی آنے سے پہلے تھوڑی دیر کے لئے ہم لارنس باغ گئے تھے وہاں ہم نے کیو کھائے اور ایک ایسی عورت سے ملے جس نے اشفاق سے اپنے دوپٹے پر آٹو گراف لینے..... مجھے اس نے پہچانا نہیں ورنہ مجھ سے بھی ضرور آٹو گراف لیتی.....“

عصر کی نماز اور چائے سے بہت پہلے وہ بڑی خوش دلی ، ہلکے پھلکے مزاح سے سارے دن کی کارگزاری ، ملاقاتیں ، وقت کئی کچھ اس طرح بیان کرتے کہ کبھی بھی لیفٹاؤٹ ہونے کا احساس پیدا نہ ہوتا۔ جس طرح ٹیلی ویژن پر کرکٹ کا بیچ دیکھ کر لگتا ہے کہ آپ کرکٹ کے ہر کھلاڑی کے ساتھ ہیں ایسے ہی شہاب بھائی دن بھر کی ڈائری کچھ یوں بیان کرتے کہ لگتا ہم بھی ان دونوں کے ساتھ رہے ہیں حالانکہ صبح ہی سے ہمارا پتہ کٹ چکا ہوتا۔

دراصل شہاب بھائی کے ساتھ کبھی بھی کوئی لیفٹاؤٹ نہیں ہو سکتا تھا۔ جب کوئی ملا ، بڑی خاموشی سے ان کے ساتھ ہولیا۔ کہانی کا وسط ہو تو شہاب بھائی پوری توجہ سے پچھلی بات بتا دیتے..... کھانے کا وسط ہو تو شہاب بھائی اپنی کھانے کی رفتار یوں کم کرتے کہ آنے والے کے ساتھ ہی کھانا ختم ہوتا۔ پتہ نہیں وہ کون سا طریقہ تھا کہ شہاب بھائی سب میں گھلے ملے بھی رہتے تھے اور سب سے الگ تھلک بھی قائم۔ غالباً ان کا مقولہ تھا کہ ”ہم پاس بھی سب کے رہے اور دور بھی سب سے“۔ بہت سارے سال عصر کے بعد ملکی پھلکی چائے پیتے ہی شہاب بھائی اور خان صاحب باہر کسی نہ کسی سے ملنے چلے جاتے تو ایسی پرکھانا کھاتے اور اس کے بعد شہاب بھائی اپنے کاسنی کمرے میں ریٹائر ہو جاتے..... شام کی ملاقاتوں کا معمول بہت بعد میں شروع ہوا..... شام گئے کہ یہ ملاقاتیں غفلت کی وجہ سے ہونے لگیں ”عفت بہت بیمار ہے اور آج لاہور آ رہی ہے شاید وہ ہمارے ہاں قیام کرے تم اصرار نہ کرنا اس کی مرضی پر چھوڑ دینا.....“ خان صاحب نے مجھے صرف اتنا کہا اور ڈرائیور کے ساتھ ایئر پورٹ روانہ کر دیا۔

جب سوار یوں میں عفت اتری تو میں حیران رہ گئی۔ وہ بھرے بھرے جسم کی مال یہ فریبی عورت تھی۔ لیکن غوغاؤں میٹھیوں کی ریٹنگ کا سنارالے کر اتری اس کی ناک کا پانسہ بہت نیچا اور اونچا ، چہرہ ستا ہوا ، جسم نوبالغ لڑکی

سردی کم نہ ہوئی۔ ”جیکٹ لاؤں جی؟“..... اشیر خاں نے پوچھا۔

”ہاں بھی سردی کچھ زیادہ ہے.....“

اشیر خاں ایک سوائی گرم جیکٹ لے آئے جس پر براؤن ریشمی دھاگے کے تیل بوٹے بنے تھے۔ چونکہ یہ واحد اکلوتی جیکٹ تین بھائیوں کے درمیان تھی اور شہاب بھائی کو بھی علم تھا اس لئے انہوں نے ہلکے سے تامل کے بعد اسے بھی پس لینا۔ اور تیل بوٹوں پر کوئی اعتراض نہ کیا۔

اتنے میں اشیر خاں بھی اپنی چادر لے کر آگئے تو شہاب بھائی نے وہ بھی اوڑھ لی۔ غالباً اگر کوئی اور شخص اور کوٹ ، رضائی ، کبل ، دھوتر ، کھس ، جو کچھ بھی لاتا وہ قبول کرتے اور بغیر اعتراض کے پس لیتے..... دوسرے کامان بڑھانے کے لئے ، اس کی اہمیت بنانے کے لئے چھوٹی چھوٹی فرمائشیں کرتے..... ورنہ نہ انہیں سویٹروں کی ضرورت تھی نہ چادروں کی..... وہ اندر کی حدت سے گرم ہوتے اور اندر کا ایئر کنڈیشنر ہی ان کی سردی کا باعث ہوتا۔

صبح کاذب سے پہلے کاسنی کمرے کے بند دروازے کی پٹلی چھری سے ایک چھوٹی سی روشنی کی لکیر بھاٹکا کرتی۔ تہجد کے وقت ان کے غسل خانے کی کھڑکی سے روشنی کا ایک طہاچتہ بغلی راستے کی دیوار پر پڑتا۔ لیکن نہ تو پانی کا شور سنائی دیتا نہ کسی اور قسم کی کھڑک پر سنائی دیتی۔ کچھ لوگ جب جاگ جاتے ہیں تو پھر انہیں دوسروں کی نیند سے خاصیت پیدا ہو جاتی ہے۔ وہ اونچی اونچی اللہ کا نام لیتے ہیں۔ شپٹر شپٹر چلتے ہیں۔ ان کے منہ ہاتھ دھونے وضو کرنے سے پانی کے خوفناک چھپکے سن کر بچے جاگ اٹھتے ہیں۔ مائیں بے آرام ہو جاتی تھیں۔ لیکن شہاب بھائی کی کھڑکی کا الارم بھی کبھی کسی نے نہیں سنا..... مجھے ان کے ساتھ عمرہ کرنے کی سعادت نصیب ہوئی ہے۔ شہاب بھائی ، خاں صاحب اور میں ایک ہی کمرے میں رہتے تھے اور شہاب بھائی ہر رات تہجد گزارنے خانہ کعبہ جاتے تھے۔ رات کو وہ چوری چوری الارم لگاتے..... اور پتہ نہیں کس وقت اٹھ کر اور کیسی چابکدستی سے الارم بند کر دیتے کہ ہمیں سارے کمرے کے دور ان ایک بار بھی جاگ نہیں آئی۔ وہ جانتے تھے کہ کمزور دنیا دار ، اور طبعی طور پر کسلندی کے مارے ہوؤں کے لئے الارم کی کھنٹی تادیب کا باعث تو نہ ہوگی البتہ شرمندگی کا موقع ضرور بہم پہنچانے گی..... ہم سوئے رہتے اور وہ فجر کی نماز کے بعد تھرموس میں چائے بھروا کے ہمارے لئے لے کر آتے اور پھر ہمیں جاگتے پا کر کہتے۔

”آج..... حرم شریف کے سامنے یوں ہوا..... کیہ ایک بدو.....“

شہاب بھائی کو معلوم تھا شہروں میں گھر پر رہنے والیاں ایک ہی ماحول میں رہنے کے باعث اوب جاتی ہیں۔ ان کا رابطہ بیرونی دنیا سے کم ہوتا ہے اسی لئے وہ گھر میں گھستے ہی مجھے ، میری والدہ کو اور باقی جو بھی عورت گھر پر موجود ہوتی اسے اپنے تجربے میں شامل کر لیتے۔

شہاب بھائی اور خان صاحب ناشتے کے بعد دفتر چلے جاتے تھے دوپہر کا کھانا وہ بہت کم گھر کھاتے۔

جیسا چھریا، چال بڑھیا عورت کی طرح بے یقین، مسکراہٹ میں پشیمانی، ملال اور معذرت، آواز میں لجاجت اور آنکھوں میں میری پوری پہچان نہ تھی..... وہ میرے قریب آئی ہم بھنگمیر ہوئیں تو مجھے پتہ چلا کہ عفت پہلے سانچے میں سے بہت تخفیف کر کے نکالی گئی ہے۔ اس کے چہرے پر وہی مسکراہٹ تھی لیکن اندر بیماری نے بہت توڑ پھوڑ چا دی تھی۔ جو کام شباب بھائی اپنی خاموشی سے لیتے تھے وہی ہی ایک ڈھال عفت نے اپنی مسکراہٹ کو بنار کھا تھا۔ وہ لوگوں کو بو چھار، زیادتی اور نا سمجھی کو اسی مسکراہٹ پر روکنے کی عادی تھی۔

”اے ہے..... آگئے“ عفت نے مسکرا کر مجھے دیکھا۔

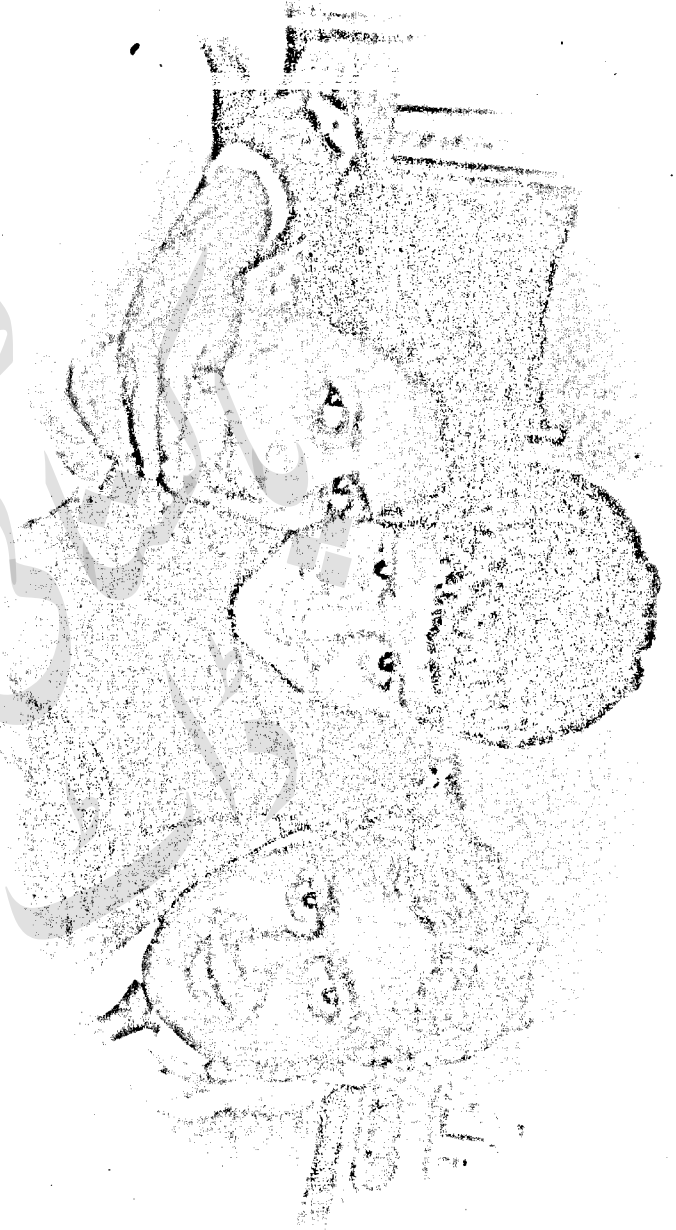
میری کوشش رہتی کہ میں عفت کے ساتھ خندہ پیشانی، خوش دلی اور ہنسی مذاق میں بھیگی ہوئی گفتگو کرتی رہوں۔ یہ تمام باتیں عفت کی فطری، طبعی اور ذاتی استعداد سے نکلتی تھیں اور میری فقط ڈرامہ تھیں۔ طبعاً میں بڑی ٹھنس عورت ہوں۔ مجھ سے نہ ذہانت بھری گفتگو ہوتی ہے نہ پر لطف باتیں میری حصے میں آتی ہیں۔ لیکن بیماری نے عفت کا جو کچھ باقی ماندہ چھوڑا تھا اس وجود سے میں اس درجہ خوفزدہ ہوئی کہ میں نے عفت کی نقالی میں بولنے کا وہ انداز اپنا لیا جس سے ظاہر تھا کہ کچھ نہیں ہوا اور عفت بالکل تندرست ہے۔

عفت بلند پوری یا کی مریض تھی اور اس کے گروے قریب قریب جواب دے چکے تھے لیکن وہ اپنے میاں کی سنگی بیوی تھی۔ وہ توجہ اپنے آپ پر، اپنی بیماری پر، اپنی مشکلات پر نہ رکھنا چاہتی تھی اسی لئے اس نے میرا فوکس آنے جانے والوں پر پھتیاں کس کر بدل دیا۔ ہم دونوں جب گھر پہنچے تو مجھے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ وہ ڈیزہ فٹ اونچی برآمدے کی کرسی تک پہنچ نہیں سکتی۔ یہاں پھر عفت نے کسی مذاق میں مجھے مشغول کر لیا اور جب وہ میرے سہارے کا سنی کمرے میں پہنچی تو مجھے بھول چکا تھا کہ وہ بیمار ہے.....

یہ ۷۳ء کا واقعہ ہے کہ ۷۴ء کا..... یہ چند ماہ کی داستان ہے کہ ایک صدی کی..... لیکن جتنی دیر عفت میرے پاس رہی۔ میرے لئے بہار کا موسم، میلے کی خوشی، اور بچپن کا زمانہ رہا۔ مجھے اس کی بیماری سے کوئی سروکار نہ تھا۔ کسی خدمت کی میں اہل نہ تھی۔ شکایت اس کے ہونٹوں پر کبھی آئی نہیں اس لئے بیماری کا باب ہم دونوں میں بند رہا۔ جب بھی ہم اکٹھی ہوتیں عفت کی طبعی مزاج پسندی کے ساتھ ہلکی پھلکی گفتگو رہتی۔ خشک، فلسفیانہ، زمانہ کشید گفتگو تب ہمیں راس نہ آتی تھی۔

اندر سے عفت قریب قریب مایوس ہو چکی تھی وہ لندن میں بڑی دیر علاج کروانے کے بعد لوٹی تھی اور اسے معلوم تھا کہ بیماری کی جس منزل میں وہ ہے وہاں ایلوپیتھک علاج کے پاس کوئی حل نہ تھا۔ اس لئے وہ کسی معجزے کی تلاش میں تھی کوئی ٹوٹکا، تعویذ، وعدہ امید..... جو اس کے آخری ایام خوشگوار بنادے۔

اسی سلسلے میں خان صاحب ہمیں باباجی نور والے کے ڈیرے پر لے گئے..... خان صاحب میں ایک بڑی خوبی ہے۔ وہ صاحب کمال آدمیوں سے بہت متاثر ہوتے ہیں۔ ایسا شخص چاہے جوتی گا نھتا ہو، چاہے آئی سی ایس ہو وہ اس کی درگاہ پر جاتے ضرور ہیں۔ باباجی نور والے دھرم پورہ میں رہتے تھے۔ ان کا ڈیرہ بکریوں، لوگوں،



ان گنت چار پائیوں، بستروں، بھینسوں، مرغیوں، مریضوں، اور سبز پوش درویشوں کا ملغوبہ تھا۔ یہاں سے سب کچھ ہوتا چلا جاتا تھا ہر کوئی تجویز نہ تھی۔ سب آنے جانے والے کھانا کھاتے پر آٹا ناپ تول سے نہ گوندھا جاتا۔ یہاں اشفاق صاحب مجھے اور بچوں کو کبھی کبھی لے کر جایا کرتے لیکن عفت کے آنے کے بعد یہ معمول ہو گیا کہ ہم ڈیرہ پاک جاتے اور وہاں پہروں رہتے بابا جی عفت کا علاج بالغذا کرتے۔ عفت سارا دن میں دو مرتبہ دیر کھاتی اور انار کا رس پیتی۔ ان ہی ملاقاتوں کے دوران ایک روز بابا جی نے فرمایا کہ۔ ”جعمرات کے روز ہم تم دونوں کو دھو کر آئیں گے۔ تم دونوں کھری ہو اور تمہارا پاک کرنا ہمارا فرض ہے۔“

میں ”پاک کرانے“ کی اصطلاح سے ناواقف تھی اور جی میں اس لئے خوش تھی کہ یہ بھی ضرور کوئی اعزاز ہو گا اس لئے حاصل کرنا چاہئے لیکن عفت واپسی پر غم سم تھی ”کیوں کیا ہوا ہے.....؟“ میں نے سوال کیا۔

”کچھ نہیں.....“

”اگر کچھ نہیں تو یہ لمبا نہ کیوں بنایا ہے.....“

”بھئی میں رات کو شہاب کو فون کر دوں گی۔ بابا جی ہماری بیعت چاہتے ہیں۔“

مجھے یہ بھی معلوم نہ تھا کہ پاک کرنا اور اصل بیعت کے مترادف ہے۔ پھر بیعت تو خوشی کی بات تھی۔

”تو ہم بیعت کر لیں گے اس قدر پریشان کیوں ہو.....“

”بے نا پریشانی.....“

شام عفت نے اسلام آباد فون کیا۔ پھر میرے پاس آئی اور کہنے لگی..... ”شہاب صاحب نے منع کر دیا ہے۔ ہم عورتیں ہیں۔ ہم کہاں بابا جی کے تمام احکامات مان سکتی ہیں۔ کل کلاں، وہ یہی کہہ دیں کہ بچے ڈیرے پر چھوڑ جاؤ تو کیا ہم ایسا کر سکتی ہیں۔ اگر وہ کہہ دیں سارا زور ڈیرے پاک کی خیراتی تجویز میں ڈال دو تو کیا ہم ایسا کر لیں گی؟“

”تو پھر کیا ہوا؟ بابا جی بہت ریزن ایبل آدمی ہیں۔ اول تو وہ ایسے احکامات دے ہی نہیں سکتے اور بالفرض دیے بھی تو ہم جو بات لو جیکل ہو گی مان لیں گے باقی کے لئے معذرت کر لیں گے۔“

”بیعت بیعت ہوتی ہے کوئی نکاح نامہ نہیں ہوتا..... جو کچھ جی چاہا مان لیا جو نہ چاہا، شوہر سے انکاری ہو گئے۔“

مجھے نہ پاک ہونے سے کوئی سروکار تھا نہ بیعت کرنے کی بنیادی شرائط کا علم تھا۔ ہر کیف جو اہمیت ہم کو حاصل ہونا تھی وہ نہ ہو سکی اور جعمرات کے دن ہم ڈیرہ پاک نہ گئے۔ اس بات کا مدتوں مجھے رنج رہا۔

بہت سالوں بعد جب انیق خاں نے شہاب بھائی سے بیعت کرنا چاہی اور میں نے بہت اصرار کیا تو

شہاب بھائی بولے..... ”فی زمانہ بیعت بہت مشکل ہے۔ تعلیم اور ذہانت بہت بڑھ گئی ہے۔ مغربی انداز فکر نے ہم میں خود سوچنے کی صلاحیت بہت زیادہ پیدا کر دی ہے۔ اس لئے بیعت کرنے والا پھندے میں پھنس جاتا ہے۔ بیعت کی یہ پہلی شرط ہے کہ سالک خیال میں بھی مرشد کی نافرمانی نہ کرے کیونکہ مرشد خیال میں فیض پہنچاتا ہے اور اگر سالک دل میں بھی نافرمانی کا مرتکب ہو جائے تو نقصان کا احتمال ہے.....“

انیق خاں نے بیعت کا خیال چھوڑ دیا تو ایک مدت کے بعد شاہد خاں کی بیوی نسرین شہاب بھائی کے درپے ہو گئی۔ وہ شہاب بھائی کی بیعت کرنا چاہتی تھی۔ گورے چنے، روایت پسند، اللہ کا خوف رکھنے والے شاہد خاں ایک ٹریول ایجنسی کے مالک ہیں۔ اور ان کی بیوی نسرین پرانی مشرقی عورت ہے۔ وہ خوبصورت ہے لیکن آگاہ نہیں کہ خوبصورت ہو کر انسان کیسے محسوس کرتا ہے۔ شادی شدہ ہے لیکن بیابی عورت جیسی انا نہیں رکھتی۔ شاہد خاں سے دل کا تعلق تو رکھتی ہے لیکن زبان بند ہے۔ ایسی عورت جو تمام کیفیتوں کو اندر بند رکھنے کی عادی ہو، جب زندگی اس پر بوجھ ڈالتی ہے تو اسے ہادی رہنما، مرشد کی بڑی ضرورت ہوتی ہے.....

رات کا وقت تھا۔ میں بیمار تھی۔ کمرے میں فرش پر گدے ہی گدے تھے۔ آڑے تریچھے کسی پر کوئی لیٹا ہوا تھا، کسی پر کوئی کرسی کے بل نیم دراز تھا۔ شہاب بھائی کمرے میں موجود اکلوتے پلنگ پر خاں صاحب کے ساتھ بیٹھے تھے۔ نسرین، شاہد خاں اور ان کے تینوں بچے آئے۔ نسرین کا چہرہ ایسا تھا جیسے بن بلائے مہمان کا ہوتا ہے۔ بڑی دیر خاموشی کے بعد وہ بولی..... ”شہاب صاحب ایک بات ہے.....“

شہاب بھائی نے کمرے میں نظر دوڑائی۔ بہت سے ضروری اور غیر ضروری لوگ جمع تھے ”اکیلے میں بات کریں گی؟“

نسرین نے کچھ کن من کن من شاہد خاں سے کہا۔ وہ گردن تک سرخ ہو گیا۔

”کیا بات ہے.....؟“

اب نسرین اور شاہد میں زیر لب مکالمہ چلا۔ پتہ نہیں اصرار کیا تھا؟ اور انکار کدھر سے تھا۔ بالآخر شہاب بھائی نے پوچھا۔ ”کیا بات ہے؟“

”یہ کہہ رہی سہے تم خود ہی کہہ لو نا..... شاہد بولا۔“

نسرین کسمپائی اور بولی..... ”آپ مجھے بیعت کر لیں.....“

شہاب بھائی اتنے چپ ہو گئے کہ کمرہ جو مچلی بازار کی طرح آوازوں سے گونج رہا تھا سکتے میں آگیا پھر انہوں نے بڑی محبت سے کہا..... ”بیٹی بیعت تمہارے لئے ٹھیک نہیں..... ہاں آج سے تم مجھے اپنا

ہی راستہ پیدل نکل جاتے۔ ان کے دل میں ثاقب اور عفت کے لئے کیسی پیاری قابل اعتماد محبت تھی۔ وہ اتنے گونگے ہونے کے باوجود عفت کو خطوں میں شعر لکھتے تھے۔

اس محبت کا احساس مجھے تب اور بھی ہوا جب اچانک عفت کی طبیعت بہت بگڑ گئی۔ اس کی ناک اندر سے پک گئی تھی۔ ہولے ہولے گئے اور ناک سے لہو برسنے لگا تھا اور اسکے منہ کی رگے چہرے سے ساری خوش طبعی رخصت ہو چکی تھی۔

اس شام شہاب بھائی اسلام آباد سے آئے تو ان کے ساتھ ایک بڑا سا سوٹ کیس تھا۔ جس میں رنگ برنگی ساڑھیاں، سوٹ، سویٹر تھے۔ وہ یہ سارے کپڑے اس لئے لائے تھے کہ عفت ان کپڑوں کو پہننا پسند کرتی تھی۔ وہ عفت کو بہلانا چاہتے تھے۔ شام آ رہی تھی۔ نئے ارادوں کے ساتھ..... نئے فیصلوں کو لئے..... خدشات کو ختم دیتی..... امیدوں کو ختم کرتی۔

اس شام کے بند بوری میں بہت کچھ تھا..... شہاب بھائی تھے جو چپ چاپ کرسی میں نیچے سے ہوئے بیٹھے تھے۔ عفت تھی جو بار بار ناک تک رومال لے جاتی تھی..... ڈیرے پاک سے خربوزے کے بیجوں کی کھیر پک کر آئی تھی۔ ڈاکٹر اشرف فاضلی اصرار کر رہے تھے کہ اس کھیر کو کھانے سے افادہ ہو گا۔ عفت میں کچھ بھی کھانے کا دم خم نہ تھا۔ وہ رحم طلب نظروں سے کبھی کبھی سب کو دیکھتی اور پھر کہتی..... ”اشفاق صاحب آج تو بڑی تکلیف ہے۔“

شہاب بھائی نیچی کرسی میں چپ بیٹھے تھے۔ عفت نے رنگدار کپڑوں والی سیاہ سویٹر تلے اپنا انجر پنیر جمع کر رکھا تھا۔ بڑا اضطراب تھا..... شام میں..... موسم میں، شہاب بھائی کے دل میں..... لیکن نہ شام نے شور مچایا نہ شہاب بھائی نے کوئی دکھلاوا کیا اور دونوں عفت کا ہاتھ پکڑ کر میوہ ہسپتال چلے گئے..... شہاب بھائی اور میں کبھی کبھی عفت کو سوپ یا کوئی ہلکی پھلکی چیز دینے ہسپتال جایا کرتے تھے..... ایک روز گھر پر بہت سے لوگ جمع تھے۔ شہاب صاحب کا بھیجا، اس کے بچے..... ثریا شہاب اور اس کے بچے..... شہاب بھائی کے خاندان کے لوگ برآمدے میں آ جا رہے تھے اور وہ چپ چاپ ان سب کو دیکھ رہے تھے۔ پھر اچانک انہوں نے خان صاحب سے کہا..... ”اشفاق یہ عفت کا پروار ہے۔ ایسا پروار جس کی خوشیاں وہ نہیں دیکھ سکے گی۔“ اس وقت ثاقب بھاگتا ہوا کاسنی کمرے کے اندر گیا اور شہاب بھائی کے چہرے پر آنسوؤں نے دھاوا بول دیا..... وہ ایسے رونے لگے جیسے پہلے عشق کی وہ لڑکی روتی ہے جس کا نکاح کسی دوسرے شخص سے طے ہو چکا ہو..... ان آنسوؤں میں ٹھہراؤ نہیں تھا۔ وہ انہیں پوچھتے تھے پر یہ بھادوں کی بارش کی طرح کھڑکیوں پر گر رہے تھے۔ شہاب بھائی کو علم تھا کہ عفت لندن سے لوٹ کر نہیں آئے گی۔

پھر میں نے سوپ کی تھرموس پکڑی اور کار میں بیٹھ گئی..... شہاب بھائی نے جیب سے رومال نکالا اور دروازہ کھول کر پچھلی سیٹ پر بیٹھ گئے..... ہوا چل رہی تھی۔ پتے درختوں کو چھوڑ رہے تھے ایک پتہ

باپ سمجھ لو.....“

بلی کے بھاگوں چھینکا ٹوٹا..... بیعت کرتے تو جانے کیا کچھ کرنا پڑتا، ماننا پڑتا اب ایسی بابرکت شخصیت سے تعلق پیدا ہو گیا تو پرکتوں کے امر کوٹ میں داخل ہو گئے اور آئندہ سے رہنے لگے..... کوئی مشکل مصیبت پڑتی تو شہاب بھائی کو پکڑ لیتے ورنہ آزاد کے آزاد۔ کیونکہ شہاب بھائی نے انہیں آزاد رکھنے میں ہی ان کی عافیت دیکھی تھی۔

اور یوں تو اختیار انہوں نے ہر اس شخص کو دے رکھا تھا جو ان کے قریب تھا۔ یہی آزادی عفت کو بھی ملی ہوئی تھی۔ وہ بابابی سے علاج کرانے کے لئے لاہور میں رہتی تھی۔ شہاب بھائی نے اس پر کوئی احکامات نہیں لگائے۔ وہ کہاں ٹھہرے گی؟ کیوں ٹھہرے گی؟ یہ طے نہیں کیا..... بس عفت میرے گھر رہ کر بابابی سے علاج کرانا چاہتی تھی یہ کافی تھا۔

ایک بار مجھے خیال آیا کہ جملہ شوہروں کی طرح یہ بھی شہاب بھائی کی غفلت ہی نہ ہو۔ جو شوہر بوی کے پونچے سے نہ بندھا ہوا اس پر محبت کرنے کا احتمال نہیں ہوتا۔ عفت پر یہی بھائی کھاتی تھی۔ دوسرے کو ڈیرے پر دلیہ کھاتی، رات کے لئے دلیہ ڈیرے سے ہی لے آتی اور یہی کھاتی کر پڑہتی۔ کئی سینہ دہی خوراک کھاتی رہی اور کبھی شکایت نہ کی۔ لیکن ایک روز میں کڑا ہی گوشت پکا رہی تھی۔ وہ مسکراتی ہوئی باورچی خانے میں آئی۔

”کیا پک رہا ہے؟“ عفت بولی۔

”کڑا ہی گوشت.....“

”تجھے بھی ہر وہ چیز پکانا ہوتی ہے جو میں نہ کھاسکوں.....“

”یہ تو تمہاری مرضی ہے عفت.....“

”مرضی.....“ اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے..... ”وہ کیا ہوتی ہے؟“

”اب یہ تمہاری مرضی ہے ناں کہ شہاب بھائی اور ثاقب سے اتنی دور رہو۔ کڑا ہی کچے اور تم صرف

دلیہ کھاؤ.....“

عفت بڑی بہادر تھی۔ لیکن اس لمحے وہ بہادر نہ رہی۔ کہنے لگی ”میں شہاب اور ثاقب کو ٹرین کر رہی ہوں کہ جب میں نہ رہوں تو وہ میری کمی زیادہ محسوس نہ کریں.....“ یہ سارا گھرانہ ہی آفتاب ہے..... میں نے دل میں سوچا۔

اب شہاب بھائی، ثاقب، ولایت میں قیام، رشتہ دار، واقعات، ان گنت باتیں زیر بحث آئیں اور عفت نے اپنے گھر کی کھڑکی کے پردے کچھ یوں کھول دیئے کہ میں باہر سے ان اندر والوں کی زندگی دیکھنے لگی۔ کس طرح لندن میں شہاب بھائی لاٹوری پر کپڑے دھونے جاتے تھے۔ پیسے کم ہوتے تو کتنا

نوٹ کرو ونڈ سکرین کے دائیں پیر سے آچٹا تھا اور رہائی چاہتا تھا۔ مجھ سے ڈیڑھ فٹ کے فاصلے پر شاب بھائی بیٹھے رو رہے تھے۔ جب کسی انسان کو میری ہمدردی کی ضرورت ہو تو میرا سارا وجود فعال ہو جاتا ہے۔ میری انا پھن اٹھا کر ڈسنے کے مقام کو دیکھتی ہے۔ مجھے ہمدردی کے کریٹ اتارتے دیر نہیں لگتی کیونکہ اسی رفاقت کے سارے میرے ہاتھ میں ایک بہت بڑا سا آ جاتا ہے۔ اپنی ذات پر دوسرے کی مکمل ممتا جی..... اور پھر میں اس مومی ناک کو جیسے چاہوں موڑ سکتی ہوں..... جدھر چاہوں چلا سکتی ہوں۔ لیکن اس وقت مجھ میں اتنی جرات نہ تھی کہ میں بائیں طرف دیکھتی تمام ہمدردی کے جملے میرے اندر سوکھ گئے۔

یوں رونے والے شخص کی محرومی کو میں نہ دیکھ سکتی تھی نہ سن سکتی تھی۔ میری آنکھیں صرف ونڈ سکرین پر لگی تھیں اور میں سوچ رہی تھی اگر ہسپتال پہنچنے پہنچنے پر آزاد ہو گیا تو عفت بھی نہ رہے گی..... اور اگر ہوا کے باوجود پتہ اپنی جگہ قائم رہا تو عفت بھی ہم میں رہے گی..... پروار کی خوشی دیکھنے کو باقی رہے گی۔

جب کار ہسپتال پہنچی تو ونڈ سکرین کا پتہ ہلکی بوند باندی سے بھیگ کر پونٹ پر دھرا تھا۔ نہ وہ ہمارے ساتھ تھانہ اڑ کر کہیں گیا تھا..... ایسے ہی عفت ہم سے بچھڑ کر لندن چلی گئی۔ تب سے شاب بھائی کے وصال تک نہ وہ اٹھ کر کہیں گئی اور نہ ہی اس نے تھما واس شاب بھائی کا ساتھ دیا!..... مسکرانے اور ہسنے والوں کی غالباً یہی ادا ہوتی ہے نہ وہ ساتھ دیتے ہیں اور نہ راہ چھوڑتے ہیں۔ اس کے جانے کے کچھ عرصہ بعد لندن سے شاب بھائی نے خان صاحب کو لکھا.....

4 viners close
sitting bonne Kent
England.

۲۳ دسمبر ۷۳ء

پیارے اشفاق اسلام علیکم

ہم یہاں پہنچے تو عفت کو مایوسی کی حالت میں تھی۔ چھ روز معجزہ رونما ہونا شروع ہوا اور اس نے آنکھ کھولی۔ اس کے بعد اس نے مجھے اور مقاب کو پہچانا شروع کیا اب اللہ کے فضل سے رفتہ رفتہ واپس آرہی ہے لیکن ابھی کچھ عرصہ Intensive تھیرپی یونٹ میں رہے گی۔ پھر نارل وارڈ میں۔ پھر انشاء اللہ گھر۔ اسی سے دعا کرتے رہیں۔

یہاں آنے سے پہلے ہمیں اندازہ تک نہ تھا کہ وہ کتنی بیمار ہے دس روز میں بارہ مرتبہ اس کا دل رک رک گیا۔ مشینوں کی مدد سے جاری رکھتے تھے۔

ایک نجیف جان پر اتنی سختی تو بہ توبہ۔

تمہارا

قدرت

ہم پر امید ہو گئے محسوس ہونے لگا کہ عفت بچ جائے گی۔ پھر جولائی میں یہ خط آ گیا۔
جولائی..... ۷۳ء

پیارے اشفاق

عفت تو چلی گئی۔ اس کے لئے اچھا ہوا ہو یہ تو اللہ جانتا ہے۔ لیکن جب آب زحرم سے غسل دے کر ہم نے اسے کفنا یا تو تنور جو بزمی سے آیا تھا رو کر کہنے لگا کہ یہ تو ایسے لگتی ہے جیسے ابھی فٹ ایئر میں داخلہ لینے چلی ہو..... اٹھارہ سال پہلے جب میں اسے بیاہ کر لایا تھا اس سے بھی کم عمر، ہشاش بشاش اور پرسکون لگ رہی تھی۔ مقاب نے اسے دیکھا، منہ لرا یا اور میرا ہاتھ پکڑ کر کہنے لگا ”امی کتنے آرام میں ہے“ لیکن جب اسے قبر میں اتارا اور مٹی نے اس کے تابوت کو ہماری نظر سے پوشیدہ کر لیا تو ہم دونوں معاکھ اس پر بیٹھ گئے۔ اب ہم آپس میں اس کی کوئی بات نہیں کرتے۔ الگ الگ چپکے چپکے رو لیتے ہوں گے۔ مجھے بالکل اندازہ نہیں تھا کہ وہ ہماری زندگی میں اتنا بڑا اخلاء پیدا کر جائے گی..... میں بے حد ڈانوا ڈول ہوں۔ تخلیہ میں رو کر اندر کی آگ اور بھی بھڑک اٹھتی ہے مقاب اور میں نے باہم فیصلہ کر لیا ہے کہ اب واپس گھر چلیں۔ عفت کا سامان پچھلے ہفتے لیور پول کی بندر گاہ پر پہنچا ہے ہم اسے وصول کئے بغیر واپس پاکستان بھیج رہے ہیں

بانوا اور بچوں کو پیار

تمہارا

قدرت

عفت کے رخصت ہونے کے بعد یک دم خان صاحب کا رویہ شاب بھائی کے ساتھ بدل گیا۔ خان میں ایک بڑی خرابی ہے وہ اپنے پروگرام ’اپنے ارادے‘ اپنی پرائیویٹ ذاتی زندگی کسی دوسرے ذی روح کے ساتھ شیئر نہیں کرنا چاہتے۔ اگر وہ کسی کی مدد کریں اور بات نکل جائے تو انہیں رنج ہو گا۔ اگر وہ کسی سے پریم کریں اور افشائے راز ہو تو بھی وہ مجھ ہو کر رہ جائیں گے..... ان کی ڈاک میں سے اگر کوئی اورنگی کا رسالہ کھول لے یا واپس آئی ایس کے سائیکلو سٹائل لمبے لفافے یا ایسٹنی کا اخبار اگر انہیں دوسرے ہاتھ کھلائے تو ان کی طبیعت پر گراں گزرتا ہے۔ خان ساگرہ کی تقریب ’مندی کی رسم‘ اچھل اچھل کر بنگلہ یال، فتمیں کھا کھا کر وعدے، اونچے اونچے مبارک بادیاں، ہاتھ بلا بلا کر خدا حافظیں دوپٹہ بدل سہیلیاں، واضح طور پر سچے ہوئے گھر اور بھڑکی عورتیں ناپسند کرتے ہیں..... خان صاحب کو نئے نئے بیٹ، چھپ چھپا کر بہت زیادہ سجاوٹ کرنے والی عورتیں، بغیر شکر یہ

تخت وصول کرنے والے لوگ، ذہانت کو چھپا کر بات کرنے والا شخص، سادہ لباس، سادہ خوراک، بغیر تقنع کے سچے سچے گھر میں رہنے والے پرکار باسی پسند ہیں..... خان کے ساتھ ایک عرصہ رہنے کے بعد پتہ چلا کہ یہ افشائے راز کی زندگی دراصل ان کے Genes سے آئی ہے۔ جب ان کے آبؤ اجداد پتھر لے سنگلاب پہاڑوں میں رہتے ہوں گے اور دوستی ناپائیدار اور دشمنی لازوال ہوگی، تب ماؤں نے بچوں کو غیرت کا انمول تصور برہمنوں کے ساتھ دیا ہوگا..... یہی بڑھی ہوئی غیرت جو پٹھان کے تحفظ کا کلوتا نسخہ ہے خان کے لبوں میں بھگدڑ اور فرمودہ موجود ہے۔ وہ سیاست، کلچر، اسلام، تعلیم اور ایسے تمام موضوعات جو ان کی ذات کے مرکز کو نہ چھوئیں بڑی آسانی سے زیر بحث لاسکتے ہیں۔ لیکن آپ کو اپنی ذات کا سراغ دے کر وہ زندگی کا سب سے بڑا خطرہ مول نہیں لے سکتے۔ اس طرح اشفاق احمد غیر محفوظ ہو جاتا ہے۔

ان کی الماری میں دو چھوٹے چھوٹے پلاسٹک کے ٹرے ہیں اور اسی الماری کے اور تین خانے بھی خاں کی تحویل میں ہیں۔ کمرے، ٹیپ ریکارڈ، بیڑیاں، پرانے سیل، مائیکروفون وغیرہ کے علاوہ ان دو زرد رنگ کی فوٹو گرافک ٹریز میں بی۔ آئی۔ اے کے پرانے ٹکٹ، ایسے لٹریچر جن سے نہ کچھ دور کا نظر آتا ہے نہ قریب کا، کتھا لگی سپاریاں، سپرنگ، کامن پنیں، باسی پان، ایسے سکے جو متروک ہو چکے ہیں، پرانی عینک جس کا نمبر لاگو نہیں، خشک انک پاٹ، نہ چلنے والے مارکر، فروخت شدہ فوکسی ہسٹو اور سائیکلوں کی چابیاں، ایسے وزٹنگ کارڈ جن کے مالکوں سے ملنے کا انہوں نے کبھی ارادہ کیا ہوگا، مفتی جی کی دی ہوئی ہو میو پیسٹی کی پڑیاں، انیس خاں کے خط، خانہ کعبہ کے گرد سے چنی ہوئی سنگریاں، کسی کا پھولدار رومال، عجوں کی ڈبیا، چورن کی پینٹکی، فیوز بلب.....

یہاں اس الماری میں ایک کائنات آباد ہے..... گرد سے ڈھکی ہوئی، نظروں سے اوجھل، خاں کی سیکرٹ لائف کے کئی ورق یہاں موجود ہیں جنہیں شاید کوئی باہر کا شخص تو انٹرنیٹ نہیں کر سکتا لیکن خاں صاحب ایک ہی نظر میں کبھی گریمز بل بوتے ہیں کبھی جمیل سیف الملوک پر..... کبھی وہ اسلود کچھ سکتے ہیں..... اور کبھی شگفتائی۔ ان کی یادوں کی بارات کے یہ نشیون کسی کی سمجھ میں نہیں آتے۔ اسی لئے جب کبھی میں ان کی الماری صاف کرنا چاہتی ہوں وہ بچے کی طرح ہلک کر کہتے ہیں..... ”سارا گھر تمہارے جھاڑن کا منتظر ہے اس کو نہ کو اگر رہنے دو تو کوئی قیامت آجائے گی۔“

اپنی ذات کو چھپا کر رکھنے والے خان صاحب عفت کے جانے کے بعد اپنے اندر کے جذبات زیادہ چھپانہ سکے۔ اب وہ موقع بے موقعہ اسلام آباد جانے لگے۔ کبھی کبھی ہفتے میں دو بار بھی اسلام آباد جانے کا اتفاق ہوتا۔ لیکن اگر کوئی یہ کہہ بیٹھتا کہ آپ شہاب بھائی سے ملنے جا رہے ہیں تو پھر افشائے راز ہوتے ہی خان کو غصہ آجاتا۔ ہر سفر سرکاری میٹنگ کے سلسلے میں ہوتا تھا کہ اس کی ٹکٹ وہ پہلے سے خریدتے..... ہمیشہ شہاب بھائی کے گھر ٹھہرتے بھانویں انتظام ہوٹل میں ہوتا۔

شہاب بھائی بھی خاں صاحب کی طرح افشائے راز سے بدکتے تھے۔ ان کی زندگی بھی برسوں گپت ہی چلی آ رہی تھی۔ لیکن عفت کے جانے کے بعد پتہ نہیں وہ کون سا راز تھا جس کی طرف ان کی توجہ ہو سکتی کہ انہوں نے اپنی زندگی، اپنا گھر، اپنا کمرہ، اپنی نمازیں، اپنی بزرگی آہستہ آہستہ سب کچھ لوگوں کے حوالے کرنا شروع کر دیا۔ اب نہ زندگی کو راز رکھنے میں انہیں کوئی دلچسپی تھی نہ اللہ کا بندہ کھلانے میں کوئی عار تھا..... ان کے راز عفت کے جاتے ہی بدل گئے تھے۔ اب انہوں نے فین، اخبار، پرانی بوٹلیں، ٹوٹا فرنیچر، بوسیدہ قالین سب سرعام ڈال دیئے تھے اور ایک کوہ نور، ہیرادل میں چھپایا تھا جس کی ایک جھلک بھی کسی کو دکھانے بغیر وہ حسن خاتمہ تک پہنچ گئے۔ خاں صاحب کی الماری میں ٹھونسٹھونس ضروری غیر ضروری سامان پڑا رہتا ہے اس لئے کہ یہ کثافت ان کی روح کی لطافت کے لئے ضروری ہے۔ شہاب بھائی کے کمرے کا سامان بے ربط اس لئے دھرا رہ گیا کہ اس کا مالک کوئی نہ تھا جو ان کو باربٹ کر سکتا..... اس کو دھرنے سنوارنے والی تو بہت پہلے رخصت ہو چکی تھی اور گھر والی کے بغیر گھر کے سامان کی شہاب بھائی کے نزدیک کوئی اہمیت نہ تھی۔

شہاب بھائی کے کمرے میں دروازے کے آگے ایسا سائیز بورڈ تھا جس پر کتابیں اینٹوں کی طرح لدی تھیں۔ ساتھ ہی وہ صوفہ تھا جس پر ہلکے فیروز رنگ کا کپڑا چڑھا تھا۔ دو پلنگ، ایک الماری، ڈریسنگ ٹیبل، جس کا سفید فارمائی کا سنگ مرمر سے بھی زیادہ ملائم تھا۔ اس کے علاوہ تین چار چھوٹی میز، کچھ گاؤں کے کتے، کچھ گدیاں، ان گنت کتابیں، بوتیاں، بیڑ موجود تھے۔ ڈریسنگ ٹیبل پر سینٹ کی بھری بوتلوں کے ساتھ خالی بوتلیں بھی موجود تھیں۔ اندر بظنی کمرے میں ان گنت سوٹ کیس، رخ دان، بچے، الماری، اٹیچی، ٹیک موجود تھے..... یہ سامان برسوں ایسے ہی رہا۔ جیسے وہ منظر بدلنا نہ چاہتے تھے۔ عفت جس چاؤ سے فرنیچر یا لینڈ سے بنوا کر لائی تھی اس فرنیچر کو ویسے کاویسا بلا ضرورت رہنے دینا ہی ان کے لئے کافی تھا۔ سوٹ کیسوں میں عفت کے کپڑے بوسیدہ اور پرانے ہو رہے تھے لیکن شہاب بھائی میں ہمت نہ تھی کہ ان کو نکال کر بانٹیں یا استعمال میں لائیں۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ وہ عفت سے کچھ ایسی دیوانہ وار محبت کرتے تھے کہ اس کا سامان بانٹ کر انہیں دکھ ہوتا بلکہ انہوں نے اندر ایسا سکون تلاش کر لیا تھا جو تبدیلیوں کا تحمل نہیں ہوتا۔ اللہ کی محبت کا جو نور انہیں اندر مل گیا تھا، اس کا یہی تقاضا تھا کہ باہر کے ماحول میں کم سے کم پھل پیدا ہو۔ اسی اکلوتے راز کے تحفظ کے لئے وہ اپنی بہن محمودہ کے پاس رہنے لگے اور حسن خاتمہ سے بہت پہلے اپنی ساری املاک کا مالک انہوں نے عاقب کو کر دیا۔ خان پرانی بیکار چیزوں سے چھٹکارا حاصل نہ کر سکے کیونکہ وہ ابھی ان لمحات میں گرفتار تھے جب یہ اشیاء ان کے ہاتھ آئی تھیں۔ شہاب بھائی کے لئے سب بیکار ہو گیا تھا۔ فرنیچر و کتابیں، قلم، قلمدان، گلدان، تصویروں، جوتے، بیڑ، قالین، چیزوں کے چھوٹے چھوٹے بے معنی اخبار، شہاب بھائی ان سب

ہیں۔ قدسیہ نے ایک چادر اوڑھ رکھی ہے اس کی گود میں ہمارا بچہ اٹھ رہا ہے جس کی عمر مشکل سے سال ڈیڑھ سال کی ہے۔ دوسرے بچے شاید ہیں نہیں یا وہ کہیں گئے ہوئے ہیں۔ ہم بیڑھیاں اترتے ہیں باباجی آگے آگے ہیں اور ہم ان کے پیچھے..... بلوائیوں کو پتہ ضرور چلتا ہے لیکن وہ دور دور مجبور سے رہ جاتے ہیں۔ ہم خاموشی کے ساتھ ڈرتے ڈرتے سسے سسے نکل جاتے ہیں۔ رات کا وقت ہے گلیوں بازاروں میں بڑا جھوم ہے جیسے کوئی عید ہو اور لوگ ایک دوسرے سے گلے ملنے، رگڑ لگاتے سمندر کی لہروں کی طرح چل رہے ہیں۔ ہم بھی ان میں رواں ہیں پھر باباجی سے ہمارا ساتھ چھوٹ جاتا ہے۔ ہم کو ایک خاص مقام پر پہنچنا ہے شاید مسجد وزیر خان تک یا سنہری مسجد تک لیکن ہمیں اس کا راستہ نہیں ملتا..... پھر ہم سواریوں کے ایک تانگے میں بیٹھ جاتے ہیں۔ اس میں ایک خوبصورت بڑی سی عمری برقعہ پوش خاتون ہے۔ سفید رنگت بھرا بھرا جسم اس نے نقاب الٹ رکھا ہے اور قدسیہ سے باتیں کر رہی ہے۔ قدسیہ کہتی ہے ”بس جی ہم کو اپنی منزل تک جانا ہے لیکن راستہ نہیں ملتا۔“ وہ منزل کے اوپر کچھ دینا شروع کر دیتی ہے اور بتاتی ہے کہ یوں جاؤ یوں جاؤ۔ لیکن ہماری مدد نہیں کرتی۔ بس قال ہی قال ہے۔ میں قدسیہ سے کہتا ہوں قدسیہ ذرا اس بچے کو سنبھال کر رکھو یہ بچہ نہیں نورایمان ہے۔ اس کی حفاظت لازمی ہے۔ وہ کہتی ہے ”میں نے اس کو سینے سے چننا رکھا ہے آپ فکر نہ کریں۔“ پھر ہم تانگے سے اترتے ہیں۔ آدمیوں کا سمندر بدستور بل کھا رہا ہے۔ ہم ہر ایک سے راستہ پوچھتے ہیں لیکن ہر کوئی کچھ سادے کر چلا جاتا ہے۔ پھر ہم دونوں آگے چل دیتے ہیں چھوٹی چھوٹی تنگ گلیاں جیسے قصور شہر کی ہیں ان میں سے گزرتے ہیں۔ گلیاں مڑتی جاتی ہیں بل کھائے جاتی ہیں لیکن راستہ نہیں ملتا۔ ہم ٹوٹی ہوئی دیواروں کے موکھوں میں سے بھی گزر جاتے ہیں گول Tunnels میں سے بھی گزر جاتے ہیں۔ ایک چھوٹا سا چوک آ جاتا ہے۔ ہم آگے بڑھتے ہیں تو ایک دیوار پھسل کر سامنے آ جاتی ہے دوسری طرف جاتے ہیں تو ایک دیوار آگے بڑھ آتی ہے۔ ہم اپنے سے زیادہ اس بچے کو منزل کی طرف لے جانے میں کوشاں ہیں..... پھر میں گھبرا کر جاگ اٹھا خوف اور ڈر سے میرا بدن کانپ رہا تھا۔ میں نے دیکھا قدرت میرے قریب پٹنگ پر گھوک سویا ہوا تھا اس کی ساتھ والی چار پائی پر ناقب تھا۔ میں اپنے بستر پر بیٹھا رہا اور سوچنے لگا کہ اگر میں نے پھر سوئے کی کوشش کی تو یہ خواب پھر شروع ہو جائے گا۔ پھر میں نے کہا اس خواب کو لکھ لوں صبح بھول جائیگا۔ لیکن اس وقت جی جلائی نہیں چاہتا تھا۔ ناچار مویا۔ مجرہ خواب نہیں آیا۔ صبح اٹھ کر یہ خواب نوٹ کیا۔

یہ خواب میں نے اس لئے یہاں لکھا ہے کہ ایسے ہی خواب وقفوں کے بعد مجھے بھی آیا کرتے

سے گزر گئے تھے جیسے بچہ لڑکپن سے نکل کر جوان ہوتا ہے اور پلٹ کر پھر کبھی چھوٹے بیٹ سے کرکٹ نہیں کھیلتا شہاب بھائی کے لئے تمام انفریشن، ساری اشیاء، ہر قسم کی ملکیت بے معنی ہو کر بیکار پڑی تھیں۔ رکھنا اور پھینک دینا دونوں بے معنی اقدامات تھے۔

اسی کمرے میں ہفتے میں ایک دو بار، مینے میں کئی بار خان صاحب جا کر رہتے۔ شہاب بھائی ہمیشہ اصرار کرتے کہ تم میرے پاس والے پٹنگ پر لیٹو۔ خاں ہمیشہ سرخ مشینی کارپٹ پر گاؤنکیہ گلدی کے نیچے پھنسا کر ایسے لینے کہ شہاب بھائی کا چہرہ ان کے مقابل ہوتا۔

جب کروٹ لے کر کہنی پر سر ٹکا کر اور ایک ٹانگ کو تہہ کر کے دوسری ٹانگ پر رکھ کر خاں پاؤں کا تلو اباتھ سے بجاتے تو شہاب بھائی متوجہ ہو جاتے۔ چاہے رات کے ڈھائی بجے ہوں چاہے فجر کے بعد کا وقت..... وہ دونوں باتیں کرنے لگتے..... شہاب بھائی نے ناقب کے علاوہ کبھی کسی کو اپنے کمرے میں سونے کی اجازت نہیں دی لیکن خاں صاحب کا فرشی بستر اوہ خود لگوا کر کرتے اور خاں صاحب کے منتظر رہتے۔

ایسی ہی ایک وزٹ میں خان صاحب نے خواب دیکھا

آج رات یعنی ۷/۳/۷۷ اور ۷/۳/۷۷ کی درمیانی رات ایک عجیب خواب دیکھا۔

یہ خواب بہت طویل اور بڑا تفصیلی تھا۔

میں نے یہ دیکھا کہ ہم ایک بڑے سارے احاطے کے ایک چوہارے میں مقیم ہیں اور گھر کا صحن خاصا کھلا ہے۔ ساتھ رہائش کی کوٹھڑیاں ہیں لیکن ہم زیادہ وقت صحن ہی میں رہتے ہیں جہاں چار پائیاں وغیرہ بچھی ہیں۔ اس احاطے میں نیچے اور بہت سے لوگ ہیں اور ایک ونگ میں ایک لوہار خانہ سا بھی ہے جہاں ہر وقت سان چلتے رہتے ہیں اور ان پر چھریاں اور آرے تیز ہوتے رہتے ہیں۔ یہ چھریاں مجھے اور میرے خاندان کو قتل کرنے کے لئے تیز کی جاتی ہیں۔ کچھ ہتھیار بھی بننے ہیں۔ ٹھناٹھن کی آواز آتی ہے۔ میں اور قدسیہ اس صورت حال سے بہت پریشان ہیں اور ہماری ہوائیاں اڑی ہوئی ہیں..... ایک شام کا وقت ہے باباجی نور والے آئے ہیں اور ہم سے کہتے ہیں کہ ”بیٹا یہاں سے نکل چلو۔“ میں اور قدسیہ کہتے ہیں کہ یہ بہت مشکل ہے کیونکہ بلوائی ہم کو پکڑ لیں گے اور قتل کر دیں گے۔ باباجی کہتے ہیں کہ کسی کے ساتھ جھگڑنے یا بحث کرنے کی ضرورت نہیں بس چپ چاپ خاموشی کے ساتھ نکل چلو۔ ڈاکٹر اشرف فاضلی صاحب بھی ساتھ ہیں کہتے ہیں ”حضور چپ چاپ جانے کی ضرورت نہیں بچا کر نکلیں گے اور ان کے ساتھ مقابلہ کریں گے۔“ باباجی منع کرتے ہیں پھر ہم وہاں سے نکلتے

”اشفاق وقت بہت ہی تنگ سپہ آؤ چلیں“

”لیکن شہاب بھائی ہم تو پانی پر چلنا نہیں جانتے.....“ میں نے کہا

”پانی پر چلنا نہیں پڑتا..... جتنی تیزی سے یہ نیچے گرتا ہے اسی رفتار سے آپ کو اوپر دھکیلتا ہے“

”جائے دے قدرت..... ہمارے پاس کار ہے ہم پہنچ جائیں گے“

شہاب بھائی مسکرائے اور دونوں ہاتھ لجا جتے سے آگے بڑھا کر بولے..... ”تم دونوں کو کچھ کرنا

نہیں پڑے گا بس مضبوطی سے میرے ہاتھ پکڑ لو..... پانی ہمیں خود بخود اوپر پہنچا دے گا.....“

ہم دونوں نے ان کا ایک ایک ہاتھ بڑی مضبوط گرفت سے پکڑ لیا اور پھر محسوس ہوا جیسے نیوٹن کا

اصول کار فرما ہے جس تیزی سے آبشار گر رہی تھی اسی سرعت سے درمیان میں شہاب بھائی دائیں بائیں

خاں اور میں آبشار پر اٹھتے جا رہے تھے..... جو خوف اور خوشی مجھے اس روز خواب میں محسوس ہوئی وہ ابھی

تک میرے ساتھ ہے..... پتہ نہیں شہاب بھائی کو خان کی کون سی ادالہ ہے.....؟

شاید وہ جانتے تھے کہ اتنی افسرانہ شان والا فقیر ہے؟

شاید وہ سمجھتے ہوں کہ فقیری کے دروازے پر دستک دینے والا ابھی دروازہ کھلنے کا تحمل نہیں؟

ہو سکتا ہے شہاب بھائی یہ بھی جانتے ہوں کہ شہرت یافتہ خان کو گمنا می زیادہ پسند ہے؟

شاید کوئی بھی وجہ نہ ہو لیکن یہ بات یقینی تھی کہ وہ لتھڑے ہوئے خاں صاحب کو دھوکہ صاف کر

کے چھوڑنا چاہتے تھے.....

بڑی دیر کی بات ہے۔

ایک روز صبح کے وقت خان صاحب اور میں سیر پر گئے..... سردیوں کا موسم تھا اور ماڈل ٹاؤن کی

سڑکوں پر کمرے کے آثار تھے۔ خان نے گرم کبیل کا پنڈلیوں تک لمبا براؤن چیک کا ڈریسنگ گاؤن

پہن رکھا تھا۔ اچانک کسی جھاڑی میں سے ایک چھوٹا سا گدگدا، موٹی گردن، بادامی بال اور معصوم

آنکھوں والا پلاٹکل آیا اور خان صاحب کے سلیپر دوں کو آکر سونگھنے لگا۔ خاں دیر سے آئے ہیں۔

وہ فطری طور پر فضلوں، درختوں، لمبے راستوں، اونچی آوازوں، جانوروں اور پرندوں سے وابستہ ہیں۔

پلے کو محبت پر آمادہ دیکھ کر وہ جھکے اور چند منٹ اس کے ساتھ کھیلنے رہے پھر ہم آگے نکل گئے۔ جب ہم

اپنی سیر سے لوٹے تو وہ پلاٹکل بھی آکھوں سمیت ابھی سڑک کنارے کھڑا تھا۔

خان نے اس کے سر پر پیار دیا اور ہم دونوں آگے آگے چل دیے لیکن کچھ دیر بعد ہمیں

احساس ہوا کہ پیچھے کوئی ہمارا تعاقب کر رہا ہے۔ پلٹ کر دیکھا تو وہی پلاٹکل تھا۔ میں نے اسے دھتکارا کہ

کس..... بال جاں نہ بن جائے لیکن خان صاحب چپ چاپ چلتے رہے..... پلٹ پلٹ کر میں دیکھتی تو

جس ہاتھ خاں ہوتے پانچ چھ قدم عین ان کے پیچھے پلاٹکل بھی چلنا نظر آتا۔ کچھ راستہ چلتے کے بعد وہ ہم سے

تھے۔

مجھے آج تک سمجھ نہیں آ سکی کہ ہم دونوں کو ایسے خواب کیوں اور کیسے آتے رہے ہیں جن

میں ہم پر بیچ راستوں پر ہیں اور رہنمائی کے بغیر نکل نہیں سکتے۔ اتنی سمجھ آگئی ہے کہ واقعی ہم غلط

راستوں پر جا نکلے یہ ابھی تک سمجھ نہیں آ سکی کہ شاہراہ کیسے ملے گی؟ اور کیوں ملے گی؟ بابے کیسے کچھ

پائیں گے جبکہ دلدل سے نکلنے کو ہمارا ہتھال نہیں چاہتا۔

جس سال بھٹو وارث تخت و تاج ہوا اور پاکستان کی عنان سنبھالی اس سال کے شروع میں مجھے

دو خواب نظر آئے دونوں میں نے مفتی جی کو لکھ دیئے ایک خواب تو بھٹو کے انجام سے متعلق تھا۔ اور

دوسرا یوگی کی خوش قسمتی کے بارے میں تھا..... میں نے خواب میں دیکھا کہ ایک پہاڑی علاقہ میں ایک

کشادہ سڑک ہے جس پر کار چل رہی ہے اور اس کار میں شہاب بھائی، میں اور خان صاحب سوار ہیں۔

لیکن کار جس قدر آگے جاتی اسی قدر پیچھے بھی دھکیلی جاتی ہے۔ پھر شہاب بھائی بولے.....

”لاؤ اشفاق میں ڈرائیو کروں..... ۸۶ء تک تو میں ہی ڈرائیو کروں گا آگے تم لے چلنا۔“

کچھ دیر کار چلتی رہتی ہے پھر ایک ایسے مقام پر جہاں نشیب میں ایک خوبصورت گاؤں اور پٹ

کی جانب ایک آبشار ہے کار رک جاتی ہے۔ پتہ نہیں کیوں خان صاحب، شہاب بھائی اور میں کار سے

اتر آئے۔ اب گاؤں کی طرف سے تین ماؤرن تعلیم یافتہ نوجوان آگے ان لوگوں کے ہاتھوں میں پھل

اور آٹو گراف تھے اور وہ بڑھتے چلے آتے تھے۔ خان صاحب ان لوگوں کے منتظر رہے لیکن شہاب بھائی

بولے..... ”اس آبشار کو دیکھو اشفاق! اس کا پانی چادر کی طرح گر رہا ہے اور شیشے کی طرح شفاف

ہے۔ اس پر چل کر اوپر جانا ہو گا۔ یہی وقت ہے۔ یہی گھڑی ہے..... ایسی چڑھائی اگر اس مقررہ وقت پر

نہ کی جائے تو پھر ممکن نہیں ہوتی.....“

اتنے میں ہاتھوں میں پھل اور آٹو گرافیں لئے نوجوانوں کی وہ ٹولی وہاں تک آگئی جہاں سڑک

کے کنارے لوہے کی زنجیروں کی باڑ ہے..... یہ نوجوان دیہاتی نہ تھے بلکہ لباس، تراش خراش اور گفتگو

سے پڑھے لکھے، دولت مند اور نازک مزاج لگتے تھے۔ خان صاحب آٹو گراف دینے، باتیں کرنے اور

پھل کھانے میں مشغول ہو گئے۔

کچھ لمبے ہی گزرے ہوں گے کہ نظر آیا شہاب بھائی آبشار پر اوپر کی طرف چڑھ رہے ہیں۔

آبشار، جو شیشے کی طرح شفاف ہے، نیچے کی جانب بہہ رہی ہے..... ان کی پٹ آبشار کی طرف ہے اور وہ

بڑے اطمینان سے اوپر کی طرف چلتے جا رہے ہیں۔

انہیں جانا دیکھ کر مجھے کچھ اتنی گھبراہٹ ہوئی کہ میں نے خان صاحب کو گھسیٹا اور ہم دونوں

بھاگ بھاگ آبشار تک پہنچے..... شہاب بھائی واپس لوٹے اور بولے.....

پھرمگیا..... لیکن خوشبو سونگھتا مہر تارباں صاحب چونکہ بنیادی طور پر کسان ہیں اور فطرت کے قریب ہیں اس لئے وہ رکے، پلے کا انتظار کیا اور جب وہ بالکل قریب آ گیا تو اسے گود میں اٹھا کر براؤن چیک والے ڈریسنگ گاؤن کے اندر سردی سے چھپایا۔

گھر پہنچتے ہی خان نے نعرہ لگایا..... ”ابھی رات بیکار اور یوگی کو کھلاؤ.....“ پلے کا نام یوگی پڑ گیا۔ اس کے لئے گوشت منگا کر ابالا گیا۔ گھر میں ایک نئے فرد کے اضافے سے رونق بڑھ گئی۔ میں یوگی کو اٹھا کر گھر کے پچھواڑے لے گئی۔ جب اس نے ندیدے بچے کی طرح فل سائز بل ڈاگ جتنا راتب کھالیا تو میں اسے خوب ہنسیا وہ اس درجہ غلیظ تھا کہ اس کے جسم سے چچراتر کر صابن کی جھاگ کے ساتھ بہہ رہے تھے۔ خوب ہنسلانے اور برش کرنے کے بعد وہ چھوٹے سے قالین کے کلوے پر لیٹ کر سو رہا۔ یوگی کے بال جوں جوں دھوپ میں خشک ہوتے گئے ویسے ہی وہ داؤد خانی گندم کے سٹوں جیسا رنگ اختیار کرتے گئے..... اس کی آنکھیں سیاہ اور کان چھوٹے چھوٹے ہاتھوں کی طرح چہرے کے گرد لپٹے ہوئے تھے۔ وہ معصومیت کی تصویر تھا۔

دوپہر کے وقت بچے سکول سے لوٹے۔ سب کو فکر تھی کہ کہیں یوگی فرار نہ ہو جائے۔ کوئی سننگلی کاسوچ رہا تھا کوئی گول پنے کا۔ کسی کا خیال تھا کہ یوگی کو اندر بندرہنا چاہئے اور جب تک وہ سب سے مانوس نہیں ہو جاتا کھلا چھوڑنا مناسب نہیں۔ میرا بھلا بیٹا انیس خاں جانوروں سے بہت پیار کرتا ہے..... شہاب بھائی اسے صوفی کہا کرتے تھے۔ صوفی کے علاوہ گھر میں رہنے والا ایک سواتی لڑکا ٹار بھی گھر آتے ہی یوگی کا عاشق ہو گیا..... انیس چونکہ دل کا زرم ہے اور کسی پر تشدد کرنا پسند نہیں کرتا اس لئے وہ سیمیں بنا کر رہ گیا لیکن ٹار نے یوگی کے گلے میں رسی باندھی اور اسے محبت کے ساتھ پھانک کے ساتھ باندھ دیا.....

صبح نہ جانے کیسے یوگی نے رسی تروائی اور گیٹ سے فرار ہو گیا۔

شاید وہ ایک بل ڈاگ جتنا راتب کھانے آیا تھا۔ شاید وہ ڈرائی کلین ہونا چاہتا تھا؟ شاید وہ یہ تجربہ کرنا چاہتا تھا کہ اپنے پیاروں کے ہاتھ سے رسی گلے میں ڈلو کر دل پر کیا بیت جاتی ہے؟

بہر کف اشفاق احمد بھی بالکل ویسے ہی یوگی تھے جسے شہاب بھائی نے اٹھا کر اپنے میروں ڈریسنگ گاؤن میں چھپالیا۔ انیس معلوم تھا کہ اس کے تن پر بڑے چچر ہیں جو اس کا لودن رات پیتے ہیں۔ وہ جانتے تھے کہ اس خوبصورت پلے کے بال سنہری، کان معصوم اور روح بہت ہی بھولی ہے۔ اسی لئے

شہاب بھائی نے غلاقت کی پروانہ کی..... چچروں کو درخور استنانہ سمجھا اور اپنی ہکل میں خان کو پناہ دی..... اس کے بعد جیجی خان سے وابستہ تھا، شہاب بھائی کی ٹرل تھی چاہے بانو، چاہے خان کے بچے، ان کے بچوں کے دوست، بیوی کی سہیلیاں، خان کے دوست، ملازم..... جو بھی یوگی کا چچر تھا

شہاب بھائی کا بوجھ تھا اور وہ خوشی سے اسے اٹھاتے تھے جیسے سمندر اپنے بچے پر بجرے، ہجاز، کشمیں لے پھرتا ہے۔

جس روز شہاب بھائی کا وصال ہوا اور ہم صبح اسلام آباد پہنچے، خاں پہلی مرتبہ نہ تو کسی راز کے افشاہونے سے ڈرے نہ ہی انہیں خوف آیا کہ لوگ کیا کہیں گے؟ وہ اونچی اونچی رو رہے تھے اس بار یوگی گیٹ سے نکل کر نہ گیا تھا بلکہ لال گاؤن والے نے اپنا سٹروپ لبادہ اتار کر رکھ دیا تھا اور بیچارہ یوگی نہیں جانتا تھا کہ اب وہ سردی سے بچنے کے لئے کس کا ڈریسنگ گاؤن تلاش کر سکتا ہے؟..... یکدم دنیا اس کے لئے بہت غیر محفوظ جگہ ہو گئی تھی..... ڈریسنگ گاؤن چھپ گیا تھا اور ہر طرف چچر ہی چچر تھے..... جو اس کا لپو چوتے تھے..... دن رات..... دن رات..... ڈیمانڈی ڈیمانڈی..... گلے ہی گلے..... اعتراض ہی اعتراض..... ہر طرف کانٹوں کے تاج۔

عفت کے جانے کے بعد شہاب بھائی وان پرست آشرم میں داخل ہو گئے۔

ہندو دھرم اور فلاسفی کے مطابق انسان کو اپنی زندگی کا طویل وقفہ چار حصوں میں تقسیم کر کے گزارنا چاہئے۔ پہلا حصہ بچپن، لڑکپن اور نوبل و غت کا ہے جب وہ بڑھتا ہے اپنے بڑوں کے چہرے، افعال اور خصائل دیکھتا ہے..... یہ کھانے پینے، بڑھنے، سیکھنے کے دن ہیں اس میں فطرت آزاد اور ذمہ داری کم سے کم ہوتی ہے۔ آدمی اپنی معصومیت کی کشتی میں سفر کرتا ہے۔ بالغ ہونے پر انسان پر گرہست کا بوجھ پڑتا ہے اور وہ بال پرست آشرم سے قدم اٹھا کر گرہست آشرم میں داخل ہو جاتا ہے..... بیس سے پینتالیس تک کا یہ وقفہ اولاد اور بیوی کی پرورش، روزی کمانے کے جتن، اپنی شخصیت کو بنانے کے دن، دوستی، موہ، مایا میں پھنسنے کا وقفہ ہے۔ جو نئی اولاد گرہست میں داخل ہو جائے ادھ بڑھے کو چاہئے کہ وہ ہولے ہولے گھر کی کچی چابی ہو کے حوالے اور دوکان، کارخانے کی ذمہ داری بیٹے کے ذمے لگائے۔ فاصلے سے دیکھتا ہے کہ کارخانہ کیسے چل رہا ہے داؤ بیچ کھاتا ہے تجربہ بتلاتا جائے پرنہ گھر پر ہو کوٹھ کے نہ دوکان پر بیٹے کو..... اور جب کچھ عرصہ بعد وہ نچنٹ ہو جائے کہ اس کے بغیر بھی دنیا چل رہی ہے اور چلتی رہے گی تو ایک روز آرام سے سرمندوئے ہاتھ میں گڑدی لئے، لبا جیو باندھے اور چپ تپ کر تادوار کا سدھارے..... پھر نہ دنیا سے علاقہ رکھنے نہ لوگوں سے۔ گنگا نشان کرنا کرتا..... بھگوان کا نام لیتا ایسا ہو رہے.....

کیرا ایسے ہو رہو جیسے نرمل نیر

چچھے پیچھے ہر پھرے کہت کیر کیر

گو شہاب بھائی پیدائشی نرمل نیر تھے لیکن وان پرست آشرم میں پہنچ کر سارے جوئے یکسر اتار کر ان میں ایک شان استیلا بھی پیدا ہو گئی تھی..... وہ ڈلک نرمل نیر کی مارتے تھے لیکن اسلام کے معاملے میں ہیرے

کی طرح سخت جان بھی تھے۔ وہ فاصلے سے ثاقب کی دیکھ رکھ، تربیت اور سلجھاؤ دیکھ رہے تھے۔ لیکن عمر، گھاٹ، دھوبی اور کتے سے فارغ ہو چکے تھے۔ انہوں نے وہ تمام بوجھ اتار دیئے جو گرہست کی بنیادی ضرورت ہیں۔

نہ ان کا کوئی گھر تھانہ گھر والی

نہ ان کے کوئی ملازم تھے۔ نہ خدمت گزار یاں

بجلی کا بل سوئی گیس..... پلیر، گٹر کھولنے والا، خانسامہ، مالی..... سب سے وہ آزاد تھے۔ وہ شانتی سے اپنی بہن کے گھر میں رہتے جو ملتا کھاتے..... ہر سال کوئی نہ کوئی مرغوب غذا، کوئی پیارا دوست، کوئی جان لیوا رابطہ ختم کر دیتے..... بازار صرف پھل خریدنے جاتے باقی خرید و فروخت انہوں نے دوسروں پر چھوڑ دی تھی..... پہلے کار خود چلاتے تھے پھر کار چلا تو سکتے تھے لیکن ثاقب یا کسی دوسرے بچے کے دست نگر ہونے میں لذت محسوس کرتے اس طرح مہاتما بدھ کا Begging bowl بغیر کسی اعلان یا کسی شو آف کے ان کے ہاتھ میں آگیا۔

جب انشاجی زندہ تھے اور عفت کو گئے زیادہ عرصہ نہیں ہوا تھا۔ تو ہم لوگ اندر اندر یہ پھجڑی پکا کرتے کہ شہاب بھائی کو دوسری شادی کر لینی چاہیے۔ ان کے لیے ہم لوگ کچھ رشتے بھی تجویز کیا کرتے۔ اگر ہمارا بس چلتا تو ہم شہاب بھائی کو گرہست آشرم سے نکلتے ہی دوبارہ زنجبیر پا کرتے۔ ایک روز انشاجی نے خان کی ڈیوٹی لگائی کہ آدھی رات کو جب پرائیویٹ گفتگو کا شرم شروع ہو تو شہاب بھائی کی خانہ آبادی کا سلسلہ جوڑو۔

شہاب بھائی ہمیشہ کی طرح خاں صاحب کی کلینٹسے بھری تجویزات سنتے رہے اور بڑی دیر بعد بولے ”اشفاق تم میرا مطلب غلط نہ سمجھنا۔ عفت کے ساتھ جو خوشگوار وقت گزارا ہے اس کا تقاضا یہی ہے کہ میں شادی کر لوں اور وہ بھی کسی لیڈی ڈاکٹر سے..... لیکن اب جی نہیں چاہتا..... جب ایک باریہ بی کٹ جائے تو دوبارہ قید ہونے کا مقصد؟ دائرہ ختم کر کے دوبارہ دائرے کا سفر کیوں؟ اشفاق..... سنو

اک دن رہیں بسنت میں

اک دن جنیں ہمار میں

اک دن پھر بس بے انت میں

اک دن چلیں خمار میں

دودن رکیں گرہست میں

اک دن کسی دیار میں

دودن گرہست میں رکنے کے بعد شہاب بھائی مستقل طور پر اپنی بہن محمودہ کے دیار میں رہنے۔



لگے یہاں ثاقب کو بیٹھے بٹھائے ایک بڑی بس گڈی، اور دو بھائی بلو اور چیل مل گئے۔ امین صاحب جیسے پھوپھا ملے جو ثاقب کو اپنے بچوں کے ساتھ پاکٹ منی دیتے تھے۔ اور محمودہ جیسی ماں ملی جو ازل سے پرورش کے دکھ بھوگتی آئی تھی۔

محمودہ جی اور شہاب بھائی گئے بس بھائی تھے لیکن ایک بنیادی فرق ہے۔ شہاب بھائی نے اپنے تمام فیصلے اللہ پر چھوڑ دیئے تھے وہ توکل، بجز اور محبت کی تصویر تھے اور محمودہ جی بچوں کو خدا کے سپرد کرنے کی اہل نہ پہلے کبھی تھیں نہ اب ہیں۔ یہ نہیں کہ وہ کم عبادت گزار، متوکل صورت، اور متقی ہیں۔ بلکہ باریک سافرق یہ ہے کہ یہ خاتون بھی تمام عورتوں کی طرح بچوں کی وجہ سے عارف دنیا ہے وہ دنیا سے اس لئے منہ نہیں موڑ سکتی کہ بچے دنیا کے بغیر پلتے نہیں وہ تمام معاملات اللہ پر اس لئے نہیں چھوڑ سکتی کہ اسے اندیشہ ہے کہ اللہ کہیں بھول نہ گیا ہو۔ ہو سکتا ہے اسے کچھ اور ضروری کام ہوں۔ ہو سکتا ہے اس کی مشیت ہی کچھ اور ہو۔ چونکہ محمودہ جی کا دل گواہی نہیں دیتا کہ اللہ عورت جیسا پالنا ہر ہو سکتا ہے۔؟ شاید وہ یہ بھی سوچتی ہیں کہ اللہ لاکھ شفیق سہی لیکن وہ ان چار بچوں کی ماں تھوڑی ہے کہ میری طرح سوچے؟ جس قدر شہاب بھائی فکر سے آزاد تھے محمودہ جی اتنا ہی زیادہ وسوسے، اندیشے، ان ہونیوں، بدگمانیوں کے الجھے ہوئے دھاگوں کو سلجھاتی رہتی ہیں۔

بچہ امتحان کی تیاری کرے۔ محمودہ جی نفل پڑھتی ہیں

بچہ رزلٹ کا منتظر ہو۔ تو بھی محمودہ جی جائے نماز پر ہوتی ہیں۔

ان چاروں میں سے کوئی لیٹ ہو جائے۔ محمودہ جی کو نفل مانتے دیر نہیں لگتی۔

ان بچوں کو کوئی پریشانی ہو تو بھی محمودہ جی کے لئے اور کوئی چارہ نہیں کہ وہ بڑے صاحب سے ہاٹ لائن پر التجا کریں۔ محمودہ جی اللہ کے گھر کی فقیرنی ہے جو ان چاروں کے لئے مانگ مانگ کر ڈگریاں، رزق، ہونٹیں، جوانی، گھر، صحتیں، ترقیاں لاتی ہیں۔ ان کی خواہشیں بڑے گھر سے پوری ہوتی رہتی ہیں۔ لیکن انہیں اطمینان نہیں ہوتا اور ہر بار جب وہ نئی ریکوسٹ لے کر جاتی ہیں اندر ہی اندر خوفزدہ رہتی ہیں کہ کہیں اس بار میری خواہش رد نہ ہو جائے کہیں اس بار اللہ درخواست پر کاٹی نہ ڈال دے۔ بچوں کی اس خیر خواہ کو کبھی یقین نہیں آیا کہ شاید بچوں کے معاملے میں اللہ بہتر سوچتا ہو۔ وہ باقی تمام معاملوں میں اللہ کو آخری اتھارٹی مانتی ہیں۔ لیکن ثاقب، گڈی، بلو اور چیل کا جب بھی کوئی معاملہ ہوا وہ سوچ بھی نہیں سکتیں کہ ان سے بھی زیادہ اللہ ان چاروں کا خیر خواہ ہو سکتا ہے۔



محمودہ جی کا وقت بڑی روٹین کے ساتھ جائے نماز، غسل خانے اور بارہی خانے میں نکلتا ہے۔ بے نماز پر وہ مانگنے میں مصروف رہتی ہیں۔ پھر جب انہیں یقین نہیں آتا کہ خدا استرا اور مانتا ہے تو انہیں دنوں، ایئر یا ہو جاتا ہے اور وہ غسل خانے کا رخ کرتی ہیں۔ اس درجہ فکر مند اور اندر سے گھبراہٹی رہتی

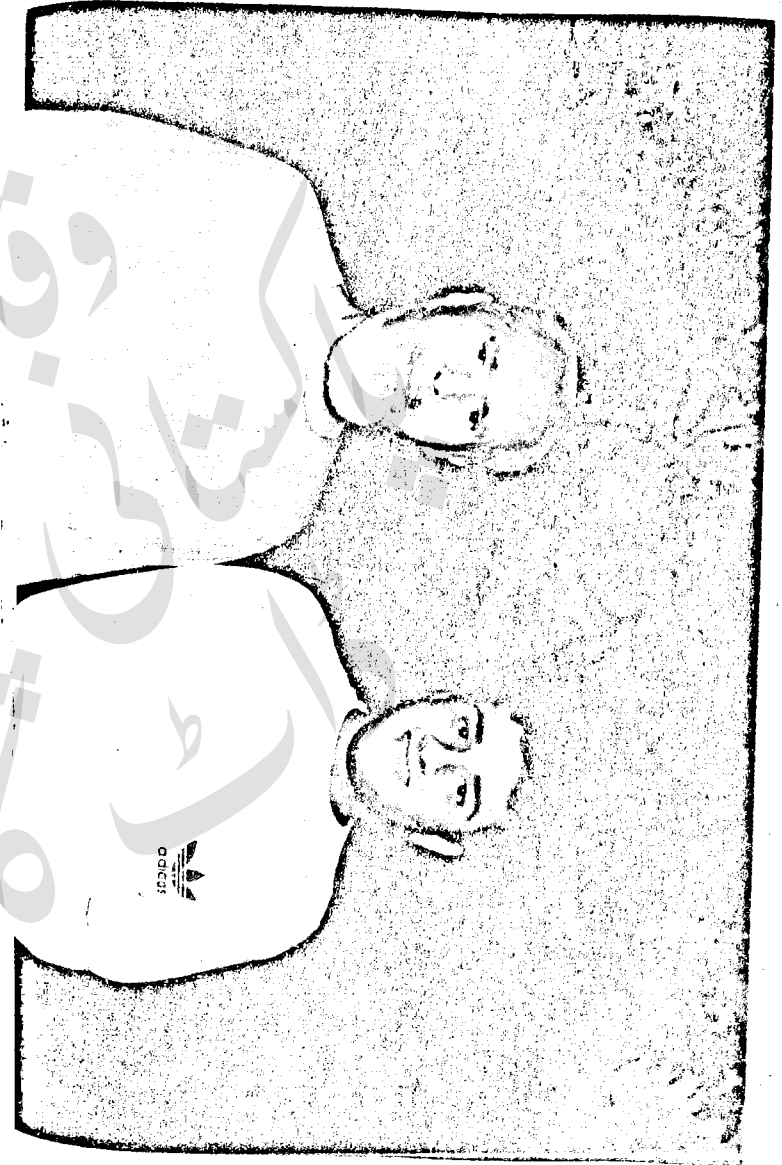
ہیں کہ انہیں سوئے ہضم کی ہمیشہ شکایت رہتی ہے..... پھلوں میں صرف کیلا کھا سکتی ہیں..... اناج میں آدھی روٹی..... وہ پیدائشی فقیر ہیں..... اپنے لئے نہ انہیں ریشم و کھوپ درکار ہے نہ آرام وہ چنگ بسترا..... اپنی ساری ضرورتیں انہوں نے سفر زندگی میں کہیں بھنگتائی ہیں اور ان سے آزاد ہو گئی ہیں۔ لیکن جیسے ان مردہ خواہشوں سے بچوں کے لئے ان گنت خواہشات کا جاگ لگ گیا ہے۔ اب وہ دم بدم مانگتی ہیں..... ہر لحظہ خوفزدہ رہتی ہیں اور جب یہ دونوں صورتیں نہ ہوں تب وہ باورچی خانے میں ان چار بچوں کے لئے کھانے پکاتی ہیں۔

محمودہ جی کی زندگی شباب بھائی کی طرح سادہ نہیں ہے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے سر دیوں کی رات تھی سب ہمارے ماسٹر بیڈ روم میں جمع تھے۔ باتوں باتوں میں بچوں کی تربیت کا سوال اٹھا۔ شباب بھائی نے کہا..... ”میں نے سنا ہے کہ بھوپت‘ اینق خاں اور صوفی انیس خاں موٹر سائیکل مانگتے تھے پھر تم نے لے کر کیوں نہ دیا شفاق!“

ہم تینوں بچوں کی تربیت بابانور والے کے فرمودات کے مطابق کرنے کے آرزو مند تھے۔ بقول ان کے بچوں کی خواہشات کا اتباع نہیں کرنا چاہئے کیونکہ اس طرح بچوں میں اتار بڑھتی ہے اور خود ان کے لئے مسئلے کا باعث بنتی ہے۔

میں نے ڈرتے ڈرتے جواب دیا۔ ”ڈر لگتا تھا شباب بھائی۔ کہیں کوئی حادثہ وغیرہ“..... شباب بھائی سکرائے اور بولے..... ”غالباً میرا رسک تم سے کہیں زیادہ ہے۔ میرا فقط ایک بیٹا ہے۔ میں یہ بھی جانتا ہوں کہ اس عمر میں موٹر سائیکل تیز چلانے کا بھی بہت شوق ہوتا ہے لیکن ثاقب کے شوق کے سامنے میری یہ احتیاط بے معنی ہے۔“ شباب بھائی نے ثاقب کو موٹر سائیکل خرید دی۔ اس کے سامنے کچھ دو دانت بھی تیزی کے تجربے میں ٹوٹے پر وہ موٹر سائیکل اس وقت تک چلاتا رہا جب تک وہ خود اس کے سسٹم میں سے نہیں نکل گئی۔ شباب بھائی نے نہ موٹر سائیکل چلانے پر پابندی لگائی نہ اس کی رفتار پر کوئی پکچر دیا..... لیکن ہم فیصلہ نہ کر سکے اسی لئے اینق خاں اور انیس خاں کو موٹر سائیکل لے کر نہ دے سکے۔

ثاقب کو میں نے پہلی بار اس وقت دیکھا جب میں رینگل میں ڈاکٹر ڈواگو کی فلم دیکھ رہی تھی اور ثاقب لندن میں تھا۔ سکرین پر ایک چھوٹا سا لڑکا اپنی ماں کے تابوت کو دیکھ رہا تھا معامیری نظروں کے سامنے آنکھیں جھپکتا، پتھریلی خاموشی کے ساتھ ٹکٹا ایک آٹھ نو برس کا لڑکا آگیا۔ وہ کس قدر شباب بھائی سے ملتا تھا۔ وہی ذہانت، شرارت بھری مسکراہٹ، ازلی اداسی اور تمنائی۔ ایک بار بیگ سے شباب بھائی نے مزاج میں لکھا تھا۔



”اشفاق!“

عاقب خوب باتیں بناتا ہے۔ اگلے خط میں اس کی تصویر بھیجوں گا۔ راہ چلتی ہر مہم سے

گھورتی ہے پیار کرتی ہے گال کھینچتی ہے پھر کتنی ہے

- What a sweet darling. Exactly looks like his father.

یہ کلمات سن کر عفت خار کھاتی ہے لیکن اپنا دل پشوری ہو جاتا ہے۔

بظاہر لگتا تھا کہ شباب بھائی عاقب سے بے نیاز ہیں۔ وہ اس کی آمد و رفت، کھانے پینے، لباس پر نہ کوئی کمنٹ کرتے تھے نہ ہی مشورہ دیتے تھے لیکن مجھے یقین ہے اب جب کہ وہ عاقب کے پاس نہیں ہیں اب بھی وہ سلع لبوں کے ساتھ اور مندی مندی آنکھوں کے ساتھ اس کی طرف دیکھتے رہتے ہیں۔ بیک سے جب بھی خط آیا کہ عاقب کا ذکر ضرور ہوتا۔ ایک خط میں لکھا تھا۔

”عاقب بدستور بولنے میں ترقی کر رہا ہے اب انگریزی کے لفظ بھی بذریعہ ڈچ سیکھ رہا ہے۔ کوئی راہ چلتا آدمی بھی چھینک مار بیٹھے تو متانت سے کھڑا ہو کر کتا ہے حمد واللہ۔“

کوئی ذرا سی ٹھوکر کھائے یا گر پڑے تو فوراً کتا ہے بش ملا۔ یہ بچے بھی خدا نے عجیب شے بنائے ہیں انسان کو دونوں عالم سے بے نیاز کر دیتے ہیں۔“

سردی کے موسم میں ان کا ایک اور خط ملا لکھا تھا۔

”عفت مرغی کی طرح عاقب اور مجھے پروں کے نیچے دبائے آرام سے بیٹھی ہے۔ اسلم اور شیر محمد بھی سردی کے مارے ڈر بے میں دیکے ہوئے ہیں۔ عاقب کے لئے پنڈی اور بیک برابر ہیں۔ اپنی زبان بولتا ہے جب کسی کو انگریزی یاد پڑے تو اس کے منہ کی طرف ٹک ٹک دیکھ کر پوچھتا ہے ”اس کو کیا ہو گیا ہے“ اب روٹھنے بھی لگا ہے اور اگر نوٹس نہ لیا جائے تو اعلان کرتا ہے ”دیکھو میں گویا ہو گیا ہوں۔“

۱۹۶۶ء میں خبر گرم تھی کہ شباب بھائی اب بیک سے واپس آنے والے ہیں۔ سفارت کے عہدے پر فائز یہ وقت انہوں نے بغیر کسی چیلنج کے گھر پر ہی گزارا تھا۔ اس قیام میں انہیں عاقب اور عفت کے ساتھ وقت گزارنے کا موقع ملا۔ اگست میں انہوں نے خان صاحب کو لکھا۔

”عاقب پاکستان آنے کی خوشی منا رہا ہے اب بھی اس کا یہی خیال ہے کہ وہاں پردہ نکال پھرا

کرے گا کیونکہ گرمی ہوتی ہے۔ دھوپ والے دن یہاں کے ساحل سمندر پر جس انداز سے لوگ لیٹے رہتے ہیں، اس سے اس نے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے۔ دوسرا سوال اس کا یہ ہے کہ سمندر پر ننگے آدمی اور عورتیں ایک دوسرے کے ساتھ ”نگر مار کر“ کیوں بیٹھتے ہیں؟“

بیک میں ایمبسڈری کے دوران عفت اور عاقب کے ساتھ ساتھ انہوں نے ایک اور راستے کو بھی تلاش کرنا شروع کر دیا تھا۔ فراغت کے لمحوں میں انہیں اپنے اندر چوری چوری کوہ نور تلاش کر کے تراشے، چمکانے اور جڑنے کا وقت مل گیا۔ ۳۱ مئی کو انہوں نے خان کو لکھا۔

”یہاں آنے کے بعد دنیا داری کو پچھتہ دے کر اپنی روحانی تربیت میں لگا ہوا ہوں۔ نماز، روزے کا پھر روز افزوں ترقی پر ہے۔ تقلیل طعام، تقلیل منام اور تقلیل کلام پر شد و حد سے عمل جاری ہے۔ چنانچہ جب سے یہاں آیا ہوں اب تک ۱۹ پونڈ وزن کم ہو چکا ہے۔ تم تازہ تازہ دہنے کو ذبح کر کے ساڑھے نو سیر چربی نکالو اور اسے بڑے سے تسلیے میں ڈال کر سامنے رکھو۔ پھر اندازہ کرو کہ ۱۹ پونڈ وزن کتنے کا مطلب کیا ہوتا ہے۔ چنانچہ نتیجے کے طور پر جسمانی، ذہنی، روحانی صحت کا احساس ہونے لگا۔ اس کے علاوہ یہاں آکر دوسرا تحفہ یہ ملا کہ گھر کی زندگی کی چاٹ کچھ یوں استوار ہو گئی کہ باہر کی ہر چیز فضول نظر آتی ہے سارا وقت عفت اور عاقب کے ساتھ گزرتا ہے یہی محبت افضل نظر آئی۔ باقی سب فروعات ہیں۔ خدا کی شان ہے کہ لوگ یورپ آکر گھر سے بدکنے لگتے ہیں۔ لیکن راقم الحروف نے وطن سے نکل کر اپنا اصلی گھر دیکھا..... وغیرہ وغیرہ۔“

یوں تو میں عاقب سے اس وقت ملی جب میں نے اسے ڈاکٹر ڈواگو کی فلم میں ایک کردار کی ٹیسٹیں دیکھا لیکن کبھی کبھی وہ مجھے نظر آنے لگا۔ ایک شام وہ پچھلے سی بلاک کے بازار میں ”اصلاح“ سے بال کٹوا کر آیا تو یکدم میں نے دیکھا یہ چھوٹا سا سانولا سلونا کرشن کشیا خان صاحب کے سلیپر پہنے ہوئے اینق خان کے ساتھ چلا آ رہا تھا۔ پھر یہ دونوں اندر غسل خانے میں چلے گئے اینق خان نے ہنر کے بالوں میں شیپو لگا یا اور اس کے بال سنک میں ایسے دھوئے کہ عاقب کی آنکھیں سرخی نظر آئیں لگیں کچھ دیر بعد یہ دونوں بار مونیہ بجانے میں مشغول تھے انہیں خان بیٹھے گا رہے تھے۔ اور عاقب تیسرے جیسے پاکستان بجانے کی مشق کر رہا تھا۔ ان بچوں کے توسط سے شباب بھائی کی جانب ایک ادرارہ نکلا۔ پہلے جب عفت حیات تھی بہم دونوں ان سب کا معصوم باتیں آپس میں کر کے خوش ہو لیتیں

Thanks for viciousness and pain
 Thanks for the stigma and shame
 Thank you for the Good Things
 And the Bad
 And the Things That Just Are

Say your Thanks and rest awhile
 For tomorrow you'll begin your Thank you's anew

SAQIB SHAHAB

BIRTH.

A drop falls
 On a still still pond
 Silently
 Shatters the world

A lion roars, somewhere
 Helpless, like man.
 Stillness
 Surrounds us

The child in the womb
 Hears the silence. And
 Is content
 His brother is quiet.

SAQIB SHAHAB

تھیں اور عام ماؤں کی طرح شیخیاں مار مار کر سمجھتی تھیں کہ ہمارے بچے ساری دنیا سے نرا لے ہیں۔ غفلت
 نئے جانے کے بعد ایسی گفتگو یکدم ختم ہو گئی۔ کچھ سالوں بعد اسلام آباد میں اچانک مجھے ثاقب کا ایک
 اور روپ نظر آیا..... وہ انگریزی میں بڑی حساس نظمیں لکھنے لگا تھا۔ ان نظموں میں اندرونی تجربات کی
 بالکل نئی پیروی لگی ہوئی تھی۔ میں یہ نظمیں کبھی کبھی خان صاحب اور شہاب بھائی کو سنانے لے جاتی اور
 چونکہ مجھے غلط وقت پر غلط بات کرنے کا بڑا ملکہ حاصل ہے اس لئے جب یہ دونوں دوست سیاسی گفتگو
 شریعت اور طریقت کی باتوں کے منہ ہار میں ہوتے ہیں ثاقب کی کاپی کا صفحہ کھول کر کہتی..... ”شہاب
 بھائی آپ ثاقب کی نظم سنیں گے؟“

ANKS

lioness pats her cub
 d is silent, quiet
 ppy with life

e zebra's howl
 s breath fading
 s fine body flailing in the dust
 A Thanks
 his attacker
 s carcass a Thanks to
 vultures the ants, A
 nks to
 e skewed nature of this world

ld up your race
 ld up your civilization
 ittingly ceaselessly
 essantly toiling
 ainful Thanks
 pay.

ank you Thank you
 the loneliness
 success
 the despair of defeat
 ank you for the warmth
 not knowing
 ank you for the obscurity that
 s within each of us
 ank you for the oblivion
 at surrounds us

نے کبھی اس ناپسندیدگی کا اظہار بھی نہیں کیا۔

شباب بھائی، ممتاز مفتی، انشاجی اور اشفاق احمد کا ایک حلقہ تھا۔ اس حلقے کے محیط پر جمیل الدین عالی تھے جو کبھی مرکز میں داخل ہو جاتے اور کبھی خط ماس کی شکل میں دائرے کو چھو کر نکل جاتے۔ اس حلقے میں تمام خوبیاں گروہ کی تھیں لیکن ایک بات ایسی تھی جس کے باعث یہ گروہ کبھی سیاسی، ادبی اور معاشی دھڑے بندی کی طرح فعال نہ ہوا۔ یہ تمام قد آور شخصیتیں ارادے کی مضبوط تھیں اور اپنی اپنی سوچ رکھتی تھیں اور فرد کی طرح ایک ہو کر کسی نظریے پر کام نہ کر سکتی تھیں۔ اسی لئے نہ ان میں کوئی ماننے والا پیدا ہوا نہ منوانے والا۔ انشاجی کو کپڑے پہننے پر اصرار کر رہے ہیں۔ کسی دوسرے کے کان پر جوں نہیں رہتی اور وہ اکیلے ہی منہ بسوہرتے بچوں کی منڈی کو ساتھ لئے کوک پینے چلے جاتے ہیں۔ مفتی جی اونچے اونچے کہہ رہے ہیں آج سے وہ نانہار میرا دوست نہیں۔ شام کو وہی شخص اشفاق احمد کے گھر میں گڈ باندھے احترام کی کرسی پر براجمان ہے۔ یہاں سفارش نہیں چلتی تھی نظریے نہیں منوائے جاتے تھے۔ بس شباب بھائی کی پھلواڑی تھی۔ زرگس، جوبی، یاسمین، گینداسی اپنی اپنی خوشبو کے ساتھ زندہ تھے اور حال مست رہتے تھے نہ کسی کو خیال آتا کہ چونکہ فلاں نے میری یہ بات نہیں مانی اس لئے اب سے میں قطع تعلق کرتا ہوں نہ اس بات کا احتمال ہی تھا کہ قطع تعلق کسی طور ہو بھی سکتا ہے۔ اختلافات کتنے بڑے کیوں نہ ہوں کوئی انہیں سلجھانے کی کوشش نہ کرتا۔ یہ شباب بھائی کی برکت تھی۔ وہ لوگوں کو نئے سرے سے پینٹ کرنے کے شوقین نہ تھے بلکہ اللہ کے بنائے ہوئے سارے رنگوں سے مفاہمت کر لیتے تھے نہ کسی کو فیشن کے طور پر اپنا تے نہ اختلاف کی وجہ سے چھوڑ دیتے۔

بڑے آدمی اور چھوٹے آدمی میں بنیادی طور پر یہی فرق ہے۔ بڑا انسان وہی ہوتا ہے جو دوسروں کے سارے تضادات کی طبیعتوں کا فرق، حالات، خیالات سارے رنگوں کو خوش دلی سے قبول کرے۔ مسلک مختلف ہو تو اپنا مسلک چھوڑے بنا دوسرے کے اعتقادات کی تعظیم کرتا رہے۔ کلچر مختلف ہو تو اعتراضات کئے بغیر دوسرے کے کلچر کو بھی اچھا سمجھتا رہے رنگ، نسل، طبقاتی اونچ نیچ، لباس، زبان غرضیکہ زیادہ سے زیادہ تضاد اور فرق کو زندگی کا حصہ اور انسان کو انسان سے ممتاز کرنے کی سہولت سمجھ لے۔ ان امتیازات کی وجہ سے نفرت کا شکار نہ ہو۔

شباب بھائی تو پولیٹیکل لیڈر تھے نہ رفاہیہ واعظ۔ بڑے آدمی تھے بڑے سے بڑا فرق یہ سمجھ کر قبول کر لیتے کہ یہ بھی اللہ کا بندہ ہے اس لئے نکتہ چینی اس پر بھی نہیں۔ انہیں کبھی کسی کو ٹوکنے، مزاحیہ، جملے کئے تنبیہ کرنے کی ضرورت محسوس نہ ہوتی کیونکہ ان کے نزدیک اختلاف، تضاد، فرق زندگی کا اصل بشر (Quite essence) تھا۔ ان کے نزدیک گوری لڑکی بھی پیاری تھی اور سیاہ سانولی بھی۔ شیعہ مسلک بھی قابل احترام تھا اور فرافر انگریزی بولنے والا ڈچ کلین شیو عیسائی بھی۔

مارے لحاظ کے دونوں چپ ہو جاتے۔ ان کی باڈی لینگویج سے پتہ چلتا گویا میں غل ہوئی۔ لیکن جوں جوں میں نظم پڑھتی شباب بھائی کا چہرہ خوشی سے شامی ہوتا چلا جاتا وہ منہ سے تعریف کا جملہ کم کر بولتے لیکن ان کے روئیں روئیں سے تحسین اور واہ کی خوشبو اٹھتی۔ شباب بھائی چند راتوں سے مقاب تک پیاری پیاری تھے۔ وہ جب بھی محبت کرتے خود انہیں احساس ہوتا کہ وہ کچھ بھی نہیں کر رہے لینے والے کی جھولی میں جگہ نہ رہتی لیکن وہ احساس ندامت میں غلطی نہ کرتے کہ حق ادا نہ ہو سکا۔ میرا طریقہ یہ ہے کہ تحفہ دینے کے بعد اشارہ پوچھتی ہوں فرمائیے اس کا رنگ پسند آیا؟ خدمت کرنے کے بعد دوسرے کے شکریے کی آس ہوتی ہے جو کچھ بھی میں کسی کے لئے کرتی ہوں ہمیشہ اسے رجسٹر کرانے کی فکر میں رہتی ہوں شباب بھائی ہوا میں اڑنے والے پون کی طرح بار آور کرتے۔ کہیں بیچ پڑ گیا تو درخت بن گیا نہیں تو بچہ بن گیا اور تلف ہوا انہیں محبت میں لین دین سودو زیاں، احسان بے احسانی کچھ درکار نہ تھا۔ وہ دلی کیفیت کو اشیاء کے حوالے سے نہیں جانتے تھے۔ محبت اس لئے کرتے کہ یہ ان کی اندرونی کیفیت تھی اس کا محبت پانے والے پر کیا اثر ہوتا تھا اس سے انہیں غرض نہ تھی۔ شباب بھائی کی عادت تھی جب وہ ہمارے گھر دو چار روز ٹھہر کر جاتے تو جمعہ رانی سردار ان کے لئے پچاس یا سو اور باقی گھر کی دیکھ کر دیکھ کر کرنے والوں کے لئے بھی ایسے ہی تناسب سے کچھ نہ کچھ چھوڑ جاتے جب وہ مجھے یہ رقم پکڑاتے تو ایک ہی جملہ مسکرا کر بولتے۔ ”یہ آپ کے Slaves کے لئے ہے۔“

کبھی کبھی ازراہ مذاق میں کہتی۔ ”اور شباب بھائی اگر میں یہ سب نہ دوں اور خود رکھ لوں؟ تو؟“ وہ ہلکا سا اشارہ ہاتھ سے کرتے اور چپ ہو جاتے۔ ان کا بس ایک ہی اصرار ہوا کرتا۔ کہ میں یہ رقم گھر کا کام کرنے والوں کو ان کی موجودگی میں نہ دوں۔

دینے دلانے کا سلسلہ بہت طویل تھا۔ کبھی ان کے گھر پر درجن بھر سلائی کی مشینیں دھری ہوتیں پوچھنے پر سب آئیں بائیں شائیں۔ اگر تحقیق کرتے تو پتہ چلتا مفلوک الحال کچھ عورتیں ہیں ان کے لئے خریدی ہیں۔ بانو قدسیہ جب بہت بیمار ہوئیں اور اشفاق اب ہو کر گھر لوٹیں تو فون بیڈ روم سے بہت دور تھا۔ شباب بھائی نے کارڈیس کچھ اس طریقے سے خرید کر دیا کہ شکریہ ادا کرنے کی نوبت ہی نہیں آئی۔ مفتی جی، اشفاق احمد، انشاجی اور جانے کون کون سے ایسے گھر تھے جدھر انہوں نے توجہ دی اور رزق، خوشی، اولاد، محبت اور جانے کیا کیا برکتوں سے گھروں کو یوں بھرا کہ دروازے بند کرنے مشکل ہو گئے۔ لیکن شاید اس ذکر سے ان کا ناخوش کرنے کا احتمال ہے اس لئے میں اس موضوع کو نہیں چھیڑتی۔ وہ لمبے لمبے القاب، بے جا شکریے، جھوٹی معذرتیں، الجھا دینے والے مناظرے، کسر نفسی کی گفتگو، تادیبی کارروائی، تنبیہی رویہ، سپاس ناموں کی زبان ناپسند کرتے تھے لیکن برملا انہوں

وہ مسجد نبویؐ کے سامنے بیٹھی ہوئی سیاہ فام افریقی عورتوں میں بھی بڑے آرام سے بیٹھ کر اپنی چپلیں کے بکل بند کرتے رہتے جس آرام اور سولت سے وہ پریذیڈنٹ ہاؤس میں کورس پر کورس کھانے میں مشغول ہوتے۔ بہت بڑے لکھوں کی محفل ہو یا چنے ان پڑھ لوگوں کی وہ نہ کسی پر بارگراں بنتے نہ کسی کو کوہ گراں جانتے..... میں نے انہیں کبھی امیروں پر نکتہ چین نہ پایا نہ ہی کسی ڈھیلی کھاٹ پر بیٹھ کر سلور کے کٹورے میں پانی پیتے ہوئے انہوں نے کسی غریب سے نفرت کی۔

رنگ سب چلتے تھے
زباںیں تمام درست تھیں
لباس سبھی موزوں تھے
علاقے تمام خوشگوار تھے
موسم تمام اچھے تھے

مذہب سب اپنے اپنے پیروکاروں کے لئے درست تھے۔

بس ایک بات پر وہ کبھی سمجھو نہ کر سکے لیکن اس کا ذکر ان کی زبان سے ابھی نہ ہوا۔ ایک کوہ نور ہیرا انہوں نے اتنے پروں میں چھپا رکھا تھا کہ شاید ان کے قریب ترین دوستوں کو بھی علم نہ ہو ابو کہ اس ضمن میں نہ وہ کچھ سن سکتے ہیں، نہ برداشت کرنے کی قوت رکھتے ہیں۔ یہ رسول اللہؐ کی ذات تھی۔ جانے وہ کیسے آویسی تھے کہ بولے بنا، اس نام کا ذکر کئے بغیر، کسی کے ساتھ اپنا جذبہ ڈسکس نہ کرتے ہوئے وہ ایک چارج سے بھرے رہتے تھے وہ لوگوں سے زیادہ ہاتھ نہ ملاتے بنگلیہ نہ ہوتے اور اسکی وجہ شاید یہی تھی کہ وہ جانتے تھے جس چارج سے وہ بھرے ہیں شاید اس کے لگتے ہی عام آدمی شوٹ نہ کھاجائے۔ اور اس انرجی سے اسے نقصان پہنچے جو ان سے ہر وقت نکلتی رہتی تھی۔

ایک شام کا ذکر ہے۔ ایک بلند وبالا شخصیت شہاب بھائی سے ملنے آئی۔ ان کا قیام سعودی عرب میں تھا کہ مکرمہ اور مسجد نبویؐ میں وہ بار بار گئے تھے اور کئی عمرے کر چکے تھے۔ ان کا عربی لب و لہجہ کھنک دار، گفتگو رواں، آنکھیں جذبے سے پر اور قلبی واردات کا سلسلہ بغیر روک ٹوک جاری تھا۔ شہاب بھائی کے مسمان پر مذہبی یو فور یا طاری تھا..... وہ بڑے جذبے کے ساتھ بار بار رسول اللہؐ کا نام ان کی زیارت، خواہوں میں آنا بڑی تفصیلاً سے بیان کر رہے تھے۔ شہاب بھائی مودب بیٹھے تھے لیکن ان کی ناک اور ہونٹوں کے زوایے سے لگ رہا تھا گویا ساری گفتگو ان پر گراں گزر رہی ہے اب مجھ سے ایک فاش غلطی ہوئی۔ میں چونکہ بنیادی طور پر ڈراما نویس ہوں اس لئے مکالمے میں میری جان ہے۔ جس وقت اس خوبرو شخص نے مسجد نبویؐ میں اپنا ایک روحانی تجربہ بیان کیا تو میں نے بھی ڈائلاگ میں مار نہ کھانے کی غرض سے اپنا ایک خواب جھوٹ چلا جلا کر زور بیان کی مدد سے سنا دیا۔

اس بیان کے دوران بھی بادل خواستہ شباب بھائی چپ رہے نہ مجھے ٹوکا نہ ہی روکا نہ کسی وقت ناراضگی کا اظہار کیا۔ شام کو وہ اسلام آباد چلے گئے اور دوسری صبح مجھے ان کا فون آیا آواز میں نہ شدت تھی نہ تنبیہ نہ وہ نصیحت کر رہے تھے نہ سمجھانے کا انداز تھا..... بس میری بہتری خیر خواہی مقصود تھی..... کہنے لگے..... روحانیت، کنشقیات وغیرہ کی واردات قلبی سراسر ذاتی تجربہ ہے اگر انہیں ظاہر کر کے ان کی تشہیر کی جائے تو یہ دوسروں کی سمجھ میں نہیں آئیں گی۔ اس لئے ان تجربات کو ہر کس و ناکس پر ظاہر نہیں کرنا چاہئے۔ اگر کسی سے باطنی اور روحانی تعلیم و تربیت حاصل کی جا رہی ہے تو اس سے کسی صورت چھپا نہ ٹھیک نہیں کبھی یہ واردات تصوراتی ہوتی ہیں یا قوت متخیلہ کی کرشمہ سازی اور انسان خواہ خواہ گمراہی کا شکار ہو جاتا ہے۔

یہ میرے لئے ان کی پہلی اور آخری سرزنش تھی۔

اس کے علاوہ شباب بھائی کا گروہ فرد افراد اور مجموعی طور پر اتنا بڑا تھا کہ میرے نمائے وجود کے لئے اس گروہ کا وجود ہی ایک بہت بڑی سرزنش تھی۔

ان بڑے لوگوں میں میرا وجود ان کے لگتے کا سا تھا..... کبھی وزن شعر میں فٹ نہ آتا تو نکتہ گرا دیتے کبھی صور ٹاسا تھ رہتا لیکن بلا یا نہ جاتا۔ کبھی سجاوٹ کے طور پر لکھ دیتے لیکن معنی ہوتے کہ پڑھانہ جائے۔ سید وارث شاہ کہتے ہیں۔

ابناں ہر نیاں دی عمر ہو چکی جو پانی شیر دی جودہ دا پیندیاں نہیں

میں بھی ایک ایسی اندھی رہتی تھی جو بڑی معصومیت سے شیروں کے ساتھ سرکس میں کام کرتی تھی۔ کبھی کبھی سوچتی ہوں کہ اتنے بڑے ادیبوں نے مجھے اپنے ساتھ لٹکا پھرنے کا اعزاز کیسے دیا؟ گو میرا کچھ بھی لکھا ہو یا یہ لوگ نہیں پڑھتے تھے لیکن کبھی کبھی شاباش کے طور پر مفتی جی ضرور دل رکھتے اور تعریف کرتے..... شباب بھائی کو مجھ جیسے پنکھا قلی پر ترس آ گیا جو برس ہا برس ٹھنڈے کمرے سے باہر بیٹھ کر پنکھا جھلٹا رہتا ہے اور اندر ٹھنڈے میں لیٹنے والے صاحب لوگوں کو علم بھی نہیں ہو پاتا کہ پنکھا قلی کو ہوا لگتی تو درکنار چھت میں لگا ہوا بڑا پنکھا بھی نظر نہیں آتا..... پھر شباب بھائی نے اپنی Wishing سے میرے لئے راستہ نکالا اور ”راجہ گدھ“ کا چرچا ہونے لگا۔ کبھی کبھی سوچتی ہوں کہ اگر یہ کتاب شباب بھائی کے علاوہ کسی اور کے نام معنون ہوتی تو اس کا جانے کیا حشر ہوتا؟۔

ہر انسان جب کسی دوسرے شخص کو جانتا ہے یا اس کے قریب ہوتا ہے تو اپنی ضرورت کے تحت فاصلہ کم کرتا ہے۔ میرے بیٹے اشیر خاں کی پیدائش کے سال بھر بعد سے لے کر عفت کی وفات تک کا عرصہ میں نے ایک خاص کیفیت میں گزارا۔ یہ بارہ تیرہ برس کا وقفہ راجہ گدھ کی جرنیلینیشن کا عرصہ اور میری جلاوطنی کا عہد ہے۔ میں ایک کابوس کی گرفت میں رہتی تھی۔ دن اور رات مجھ پر

گزر رہے تھے لڑاؤں میں۔ میں بچے پر کئی ہوئی بارش کی بوند جیسی زندگی بسر کرتی کچھ اپنے غم وجود پر پشیمیاں کچھ بچے کی چکنی جلد سے ہراساں۔

سمری طبیعت میں خوف اور حزن پیدائشی طور پر ودیعت ہے ہاتھ پر جو گرڈل آف وغیرہ وہ مجھے شامی اور آئندہ سے رہنے نہیں دیتا۔ بدلے موسموں کا خوف، لوگوں کی ناراضگی کا خدشہ، بچی باتوں کے افشا کا ہراس، پچھڑے دوستوں کی اسزوں ملاقات کا ہول، حالیہ دوستوں سے پھڑ جانے کی دہشت، رشتہ داروں کی تیوریوں کا ڈر، اولاد کے مستقبل کا خدشہ، شوہر کی ناراضگی کا کھٹکا۔ یہاں سے وہاں تک خوف ہی خوف ہیں۔ جو دن بھر میں بھیستے تو بدل لیتے ہیں لیکن غائب نہیں ہوتے۔ جو آدمی طبعی طور پر بزدل ہو وہ کراسس کے لمحات میں یا تو روتا ہے یا ہلکا جاتا ہے لیکن اگر ایسا شخص ادیب ہو تو وہ کراسس خوف اور حزن کی چھلنی میں سے نکل نکل کر تجربے کی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔ آج تمام پاکستانی اپنے وطن کے حوالے سے خدشہ اور ہراس کا شکار ہیں اسی لئے گھر گھر تجربے ہیں۔ کچھ لوگ معاشرتی اور معاشی نقصان نکال رہے ہیں۔ کچھ سوپر پاورز کے پیچھے لٹھ لئے پھرتے ہیں۔ چند لوگوں کا خیال ہے کہ ہمارے سسٹم درست نہیں۔ کئی ذہین لوگ تعلیم کو دین گوانتے ہیں۔ کچھ صاحب دل لوگوں کا خیال ہے کہ سیاسی خلاء نے یہ اتر حالت بنا رکھی ہے۔ شاید بہترینے اندر ہی اندر سمجھتے ہیں کہ خوف اور اس سے پیدا ہونے والا حزن ہی تمام ابتری کی جڑ ہے۔ یہ خوف فرد اور قوموں کو مفلوج کرنے کو کافی ہے۔ میں اس پھیلنے والے کے ساتھ پورے بارہ برس رہی ہوں۔ مجھے معلوم ہے کہ بھٹے کا چھلا والسا ہوتا چاہے تو آسمان تک دراز ہو سکتا ہے گھٹنا چاہے تو کالی مرج بن کر گردن کی شہ رگ پر آ بیٹھتا ہے۔ یہ سیاسی بکری کی طرح لٹل لٹل کرتا ہوں آگے آگے جھانکنا ہے کبھی ہاتھ کے باہر کبھی کمرے کے اندر مگر پکڑا نہیں جاتا۔ کبوتر کے پونے کی طرح جاندار اور الو کی آنکھ سا بیٹھ کھلا۔ خوف کا ذائقہ دل، زبان اور آنکھ میں ہمیشہ رہتا ہے۔ اس کے ہاتھوں تک آکر انسان خوشامدی، ڈرپوک، بزدل، جھوٹا اور جھینپو ہو جاتا ہے۔ خوف نہ صرف شخصیت کو کھاجاتا ہے۔ بلکہ ایمان اور روح بھی اس کی زوئیں رہ کر موسم زدہ لکڑی کی طرح کھوکھلے ہو جاتے ہیں۔

خوفزدہ ماں جب بچے پالتی ہے تو وہ انہیں اتار ترک، ٹیپو سلطان، اور رضیہ سلطانہ نہیں بنا سکتی اسی طرح میں نے بھی جب انیق خاں، انیس خاں اور اشیر خاں کو پالا تو ان کو وراثت میں، تعلیم میں، گفتگو میں، رہن سہن میں وٹامنز کے ساتھ ساتھ چیچ چیچ وہ خوف بھی پلانا شروع کیا جو میری طبیعت ثانیہ تھی۔ میں ان تینوں کو لے کر کسی کے گھر مشکل سے جاتی کہ شاید یہ کوئی شرارت کریں اور صاحب خانہ کو ناگوار گزرے۔ میں انہیں ان کے دوستوں کے گھر بھی نہیں جانے دیتی تھی کہ مبادا اکل کلاں کوئی جوابدہی کی صورت نکلے۔ ہر قدم پر احتیاط۔ ہر لفظ نگرانی۔ روک ٹوک۔ نصیحت جھڑکی۔

کہتے ہیں جس گھر میں ایک بڑا آدمی ہو وہاں بونے پیدا ہوتے ہیں۔ چھتارے درخت تلے کی پیڑی جب تک اکھاڑ نہ لی جائے مرجاتی ہے یا بونے درخت پیدا کرتی ہے۔ میرے تینوں بیٹے سعادت مند شریف اور ڈرے ہوئے بچے تھے کیونکہ وہ دونوں کے درمیان رہ رہے تھے۔ جب کبھی مفتی جی ہمارے گھر آتے تو بند کمروں میں وہ میرے بچوں کے ہول نکالنے کا عمل کرتے لیکن مفتی جی اپنی تمام تر انکساری کے باوجود خود قدامت سے بڑے ہیں اس لئے تھوڑی دیر بچوں کے خوف کی ہوا خوری کراتے اور پھر اپنے نوکرے قد سے اور بھی خوفزدہ کر کے چلے جاتے۔

میں آپ کو بتا رہی تھی کہ شاید میرا خوف مریضانہ تعلق اور پیاروں کی بچی خواہی کے نتیجے میں پیدا ہوا۔ اس معاملے میں غالباً تمام عورتیں اور خاص کر محمودہ جی بالکل میری طرح ہیں۔ ہم دونوں خیر خواہی، سلامتی، ترقی، فروغ کے جو خواب اور مفروضے اپنے پیاروں کے لئے ایک بار اندر رہنا چاہتی ہیں، وہ ہمیں تنکوں کی طرح اڑائے پھرتے ہیں۔ شہاب صاحب کی وجہ سے اور محمودہ جی کے باوجود ثاقب، بلو، پتیل اور گڈی تو بچے لیکن میں نے اپنے بچوں کو جنم کبھی بھی خوف کی دی۔ گزرتی بھی ہراس کی کھلائی۔ اور پسلا دو وہ بھی ڈر کی بکلی تان کر پلایا۔

عفت کی رخصتی کے بعد ایک شام اچانک بڑی زور کی آندھی چلی۔ ہمارے برآمدے میں جالی کے دروازے اور کھڑکیوں سے مٹی سے لدی ہوا آرہی تھی۔ کونٹھے پر سنوڈیو کا دروازہ پٹاخ سے بند ہوا۔ پھر باہر سندری کے درخت کی ڈالیاں زور زور سے جھولنے لگیں۔ ڈرائنگ روم کی دو دروازہ نما کھڑکیاں کھلی تھیں ان کے آگے لگے پردے کمرے کے وسط تک آ کر اپنی مرضی سے پھڑپھڑانے لگے۔ غسل خانوں میں لوٹے بھاگے لان میں گھسناوندھے ہوئے۔ پنکھوں کے سوچ بند تھے لیکن پنکھے آدھی پونی رفتار کے ساتھ چل رہے تھے۔ پلنگوں سے چادریں اڑ کر کونوں میں رول ہو رہی تھیں۔ اور گھر کے ملازم اور بچے شیشے کی کھڑکیاں دروازے بند کرنے میں مشغول تھے۔ انیق خاں کے غسل خانے کا دروازہ مسلسل بج رہا تھا۔ جیسے آندھی میں میرا دل بجاتا ہے کچھ آنسوؤں کی دستک سے کچھ جانے ان جانے خوف کی آہٹ سے۔

پھر اچانک تکی چلی گئی۔ سارا گھر آندھی اور نیم اندھیرے کی لپیٹ میں آ گیا۔ میں باورچی خانے میں تھی۔ میں نے پیٹری کی کھڑکی کا رخ کیا عموماً یہاں لائٹن دھری رہتی ہے کھڑکی سے باہر میں نے آسمان کی طرف دیکھا وہاں چھ سات روز کا چاند ملگجی آندھی کے پیچھے دکھائی پڑتا تھا۔ اس سے کچھ فاصلے پر آندھی چڑھی مٹی میں ایک ستارہ بھی ٹٹٹٹا رہا تھا۔ اس ستارے کو دیکھ کر مجھے خیال آیا کہ بچپن میں مجھے آس تھی کہ میں وہاں لوٹ جاؤں گی لیکن اب زمانے کی آندھیلی نے اسے بھی دھند میں چھپا دیا اور پلٹ جانے کی کوئی امید نہ رہی تھی۔ ساتھ والوں کے اچھی کا درخت چینی بھوت کی طرح

آندھی کی رفتار کم ہو گئی تھی اور انیق خاں کے غسل خانے کا دروازہ اب شانگنی کے ساتھ کافی دیر کے بعد بچتا تھا۔ میں شباب بھائی کے پاس بیٹھ گئی۔ کافی دیر ہم دونوں بچوں کو فوارے میں کھیلا دیکھتے رہے۔

میں نے اپنی کسی کمزوری کا ذکر نہ کیا انہوں نے کرید کے ساتھ کچھ نہ پوچھا نہ میرے حالات زندگی نہ ہی میرے اندر رہنے والے وسوسے، خوف اور ان کی نوعیت۔
بس اس روز ارشاد ہوا۔

”خوف دراصل خواہش سے جنم لینے والی کیفیت ہے۔ جو لوگ دنیا کے پیچھے بھاگتے ہیں، خوفزدہ رہتے ہیں۔ اور دنیا ان سے دور بھاگتی ہے۔ خواہش کو اپنے پیچھے پھینک دو۔ اللہ پر بھروسہ کرو۔ دنیا مثل سائے کے پیچھے پیچھے بھاگے گی۔ منفی بات سوچیں گی تو منفی کامکان بڑھے گا شبت سوچ ہوگی تو مثبت واقعات کی قطار لگ جائے گی۔“

”شباب بھائی میرا دل بہت ڈرتا ہے؟“
”کس لئے؟ یاد رکھو اول تو اللہ تعالیٰ کسی کا نقصان نہیں کرتے اور بفرض محال جس کو آپ نقصان سمجھیں ہو بھی جائے تو تلافی کے ہزار راستے ہیں۔ اللہ کے لئے کچھ مشکل نہیں۔“

اس کے بعد انہوں نے مجھے کچھ پڑھنے کے لئے عطا کیا۔
”لیکن شباب بھائی میں ایسے وظیفے پڑھنے کی عادی نہیں ہوں۔ ہو سکتا ہے کہ میں آپ کے حکم کی تعمیل نہ کر سکوں۔ ایسی صورت میں آپ ہی کچھ دعا کر دیجئے۔“

انہوں نے دعا کا وعدہ کیا اور کاسنی کمرے میں عشاء کی نماز پڑھنے کے لئے چلے گئے۔ رفتہ رفتہ اندیشوں نے ایک کن جوڑ، منجد شکل اختیار کرنا شروع کی۔ چھوٹے چھوٹے پیراگرافوں کی شکل میں راجہ گدھ تشکیل پانے لگا۔ جوں جوں کتاب صفحوں پر اترتی گئی، مجھ پر چھائے ہوئے خوف اور حزن کا بادل چھٹنے لگا۔ آندھیوں سے میں سائباں تلے آ بیٹھی۔ کرب کے ایک لمبے سفر کا اختتام ہوا۔

تب مجھے پتہ چلا کہ دعائیں تو بھی مانگتے ہیں اور سبھی کی پوری ہوتی ہیں۔ لیکن شباب بھائی مجسم دعا تھے۔ وہ جس کے لئے دعا کر دیتے اس کا یہ پاپا رہا ہوتا۔ ان کی نظر میں آجائے خدا کے گھر کی ایک بڑی سفارش تھی۔

پھر یوں ہوا۔۔۔۔۔

میں ۸۴ء کے شروع میں بڑی بیمار ہو گئی اور مجھے خون کی کمی کے باعث ہسپتال میں منتقل کر دیا گیا۔ یساف واصف علی واصف صاحب دوسرے تیسرے میری طبیعت کا پوچھنے آیا کرتے تھے ایک روز بے حد گرمی میں جب باہر چل رہی تھی واصف صاحب مجھے ملنے آئے۔ اس وقت وہاں اجمل نیازی بھی

گول مٹول مل رہا تھا۔ میں نے ماچس کی تیلی جلائی لیکن مجھے پتہ نہ چلا کہ لالٹین کدھر سے اور کیسے کھلتی ہے؟ پھر مجھے لالٹین سے ہی ڈر آنے لگا کہ یہ نہ کھلی اور اندھیرا بڑھتا گیا تو میرے بچے کیا کریں گے اس وقت جب میں اس اندیشے کے زیر اثر تھی اور لالٹین کی ہر کلام رو کر دیکھ رہی تھی مجھے بھول چکا تھا کہ سارا گھر آوازوں سے بھرا ہے میں کسی کو بھی بلا کر لالٹین جلانے کا حکم دے سکتی ہوں۔ لیکن آندھیاں، بارشیں، برفیں..... پت جھریں گرتے پتے، گرمی میں کھلے ہوئے المٹاس کے پھول..... ڈیوس روڈ پر لگے ہوئے فلیم آف دی فارسٹ کے درخت..... ان گنت چیزیں مجھ میں تبدیلی کا ہول جگاتی ہیں۔ جیسے کچھ ان ہونا ہو کر رہے گا۔۔۔۔۔

میرے خدا اور زندگی نے ہمیشہ مجھ پر رحم کھایا۔ خود میں نے اور میری طبیعت نے ہمیشہ اس رحم میں سیندھ لگائی۔

بڑی دیر لگا کر ہزار بعتن سے لالٹین جلا کر جب میں نے دوبارہ کھڑکی سے باہر دیکھا تو آندھی چاند کو بھی کہیں اڑا کر لے گئی تھی اور صرف ستارہ رہ گیا تھا۔ میں نے ڈرتے ڈرتے دعا کی کہ اے میرے رب تو جانتا ہے کہ میں بے اصل اور کمزور ہوں۔ میرے پاس ایسی کوئی چیز نہیں جس کے سارے کو میں مضبوطی سے پکڑ سکوں جو میرے خوف کے آگے ڈھال بن کر چلے۔۔۔۔۔ تو مجھے کوئی ایسا وسیلہ دے جو میری ناطقتی، نا سمجھی، نا اہلی کا بوجھ اٹھا سکے۔۔۔۔۔ جو باپ کی مانند میری ٹوٹی پھوٹی بات سمجھ سکے۔۔۔۔۔ جو ہر غلطی، قصور، گناہ کے بعد باپ ہی کی طرح میری رعایت کر سکے۔۔۔۔۔ چند ثانیے گزرے تھے کہ مجھے سلیپر کی آواز آئی پھر شباب بھائی نے ہوا سے جتنے دروازے کو پکڑ کر پوچھا۔۔۔۔۔ ”کوئی موم بتی ہوگی بانو؟“

وہ جانتے تھے کہ جس گھر میں کبھی کبھی بستر کی چادر، تولیہ، غلاف، نمک، کالی مرچ نہیں مل سکتی وہاں وثوق سے موم بتی بھی مانگی نہیں جاسکتی۔

”لالٹین ہے شباب بھائی اور ایک نارچ ہے خان صاحب کی۔۔۔۔۔“

”لالٹین ٹھیک ہے۔۔۔۔۔ نارچ آپ رکھ لیں۔۔۔۔۔“

انہوں نے لالٹین مجھ سے لی۔ اس کا ہوا کی وجہ سے شعلہ بھڑک رہا تھا اس کا ڈھکنا بند کیا جب روشنی کی لٹ سادھ ہوئی تو لالٹین لے کر وہ برآمدے میں چلے گئے۔ پھر انہوں نے یہ لالٹین کاسنی کمرے میں لے جانے کے بجائے برآمدے میں رکھ دی سارا صحن نما برآمدہ روشن ہو گیا میں کچھ دیر گودام میں، کمروں میں، فیوز باکس میں، لکھنے والی میز کی درازوں میں موم بتی تلاش کرتی رہی کچھ دیر کے بعد ایک موم بتا مجھے مل گیا بانو انیس خاں نے بہت ساری موم اکٹھی کر کے بنایا تھا۔ جب میں اسے جلا کر باہر پہنچی تو شباب بھائی چپ چاپ برآمدے کی بیچ بیٹھے تھے۔ بچوں نے باہر لان میں فوارہ چھوڑ رکھا تھا

موجود تھے۔ اتنی گرمی میں موٹر سائیکل جیسی سواری پر آنا اور عبادت کو خاموش فکر سے ادا کرنا، اپنی توجہ کچھ کرنا سے دوسرے کی تکلیف کو سنبھالنا وادھ صاحب کا ہی کمال ہے۔

اجمل نیازی نے سوال کیا..... ”واصف صاحب یہ بتائیے کہ عبادت کی حقیقت کیا ہے؟“

وہ چند لمحے چپ رہے پھر بولے..... ”کچھ لوگ پیدائشی عبادت گزار ہوتے ہیں۔ وہ اللہ کی نزدیکی چاہتے ہیں۔ کچھ لوگ عبادت کی استطاعت نہیں رکھتے انہیں صاحبان عبادت سے حصہ رکھنا چاہئے۔ مثلاً شہاب صاحب کو دیکھ لیٹا ہی عبادت ہے۔ ایسے انسان کے لئے جو عبادت کا مقدور نہ رکھتا ہو..... ان کو دیکھتے رہنا کافی ہے۔“

”میں آپ کی بات مکمل طور پر نہیں سمجھا.....“

واصف صاحب بولے..... ”کئی ملک میں ایک ٹھنڈا رہتا تھا۔ وہ بڑا مفلس تھا اور معمولی ظروف پیتل، کانسی اور دھات کے بنا کر بیچا کرتا تھا۔ لیکن یہ ٹھنڈا بڑا آرٹسٹ تھا۔ خالی اوقات میں اندرونی کو ٹھنڈی میں بیٹھ کر ایک ایسا خوبصورت ظرف بنایا کرتا جس پر خوبصورت نقش و نگار تھے۔ موتی اور فیروزے جڑے تھے۔ پندرہ سولہ برس میں یہ صراحی تیار ہوتی لیکن اس ٹھنڈے کی دوکان چھوٹی تھی اور روسا کا دھر گزرتا تھا۔ اس لئے اس خوبصورت ظرف کا کوئی خریدار نہ ملا۔

بالآخر ایک روز ٹھنڈے نے سوچا کہ ایسا قیمتی برتن اس چھوٹی دوکان میں محفوظ نہیں اسے گھر لئے چلتا ہوں وہاں طاق میں رکھوں گا۔ شام کو اس کے پہلو میں دیاروشن کروں گا جب یہ جگہ گائے گا تو صحن میں اس کے قیمتی پتھروں کی روشنی پھیلے گی۔ آنگن میں کھیلنے والوں کے چرے اس کی روشنی سے کچھ سیکھ جائیں گے۔ ٹھنڈے نے ظرف کو بغل میں اٹھایا دوکان مقفل کی اور بازار میں چلا آیا تاکہ گھر جائے..... اتفاق سے اسی وقت بادشاہ کی سواری ادھر سے گزری۔ بادشاہ کیا دیکھتا ہے کہ ایک مفلوک الحال آدمی بغل میں ایک بے انتہا خوبصورت منقش صراحی اٹھائے مودب کھڑا ہے سورج کی کرنیں جب ظرف پر پڑیں تو وہ ایسے جگمگا یا کہ بادشاہ ششدر رہ گیا۔ ٹھنڈے کو پاس بلا یا سواری سے اترا۔ صاحب کمال کو ساتھ لیا اور ظرف کی منہ منگی قیمت ادا کی۔ توشہ خانے سے خلعت سواری اور پرگنے علیحدہ موصول ہوئے.....

تو یہ عبادت کی حقیقت ہے۔ اندر والے کمرے میں جو ظرف تیار کرتا ہے اور جب باہر لاتا ہے تو توفیق کی کرنیں اس پر پڑتے ہی بازیابی ہو جاتی ہے اسی بازار میں سینکڑوں اور بھی لوگ ہوں گے لیکن خالی ہاتھ کو نوازا نہیں جاتا۔ میں یہ نہیں کہتا کرم کے لئے کوئی اصول ہے لیکن جس کے ہاتھ میں منقش ظرف ہو گا..... توفیق کی کرن پڑتے ہی وہ جگمگائے گا اور سرفرازی ضرور ہوگی۔ اس عہد میں یہ ظرف میں نے صرف شہاب صاحب کے پاس دیکھا ہے.....“

جتنی دیر میں ہسپتال رہی صاحب دعا کی توجہ مجھ پر رہی ڈاکٹروں کی محبت، اجنبی لوگوں کے خون کے عطیے دور دراز سے دعائیں شعا میں بن کر مجھ پر پڑتی رہیں۔ اسی بیماری کے دوران شہاب بھائی نے میرے لئے دوائے ”گن فیگون“ پڑھی۔ جب میں پوری طرح سے بوریا ستر باندھ کر اپنے ستارے کی طرف لوٹ جانے کے لئے تیار کھڑی تھی۔ صاحب دعا نے خاموشی سے میرا راستہ روک لیا..... اور فطرت کو اپنا فیصلہ بدلنے پر مجبور کر دیا اس بیماری سے شفا یاب ہو کر جب میں گھر پہنچی تو ایک بار پھر پریشان تھی۔ میں نے اپنی پریشانی کا ذکر شہاب بھائی سے خط میں کیا۔

خط میں ارشاد ہوا.....

”یہ جو آپ سمجھتی ہیں کہ موجودہ مملت شاید بیکار جائے کیونکہ ہسپتال والی کیفیت اور احساس اب گھر آکر دنیا داری کے زغے میں باقی نہیں رہا۔ یہ درست نہیں جس طرح کوئی پھل جب ایک بار پک جائے تو اسے کسی طرح بھی واپس کچا نہیں کیا جاسکتا۔ البتہ اس موقع سے فائدہ اٹھا کر اپنی Sense of detachment کو رفتہ رفتہ بڑھاتے رہنا چاہئے۔ جسمانی معذوری تو بیماری کے حملے نے عطا کر دی ہے۔ اس لئے گھر کے جملہ کام کاج سے ہاتھ اٹھانا آپ کا حق ہے زیادہ تر کام دوسروں پر چھوڑیں۔ ٹھیک ہوتے ہیں تو زیادہ خوش نہ ہوں۔ نہیں ٹھیک ہوتے تو ہرگز نہ کڑھیں۔ جس ڈھب پر یہ کام ہوں گے اسی ڈھب پر باقی سب کا life style خود بخود adjust ہوتا رہے گا۔ آپ اپنی توجہ زیادہ تر ذکر، فکر اور لکھنے پڑھنے میں لگائیں۔

اشفاق سے کہیں کہ وہ مولانا شرف علی تھانوی کا ترجمہ قرآن آپ کو لادے۔ اسے تھوڑا تھوڑا کر کے ہر روز پڑھیں ترجمے کے ساتھ۔ ایک بار ختم ہو جائے (خواہ کتنی دیر ہی کیوں نہ لگے) تھوڑا بارہ شروع کر دیں۔ قرآن کا پڑھنا یا زچھلنے کے مترادف ہے۔ جتنی بار پڑھا جائے اتنی ہی بار معنی کے چھلکے اترتے جاتے ہیں۔ معنی سمجھنے میں زیادہ تحقیق میں نہ پڑھیں۔ جتنا سمجھ میں آئے کافی ہے۔ رفتہ رفتہ یہ سمجھ بھی وسیع اور گہری ہوتی جائے گی۔ البتہ یہ خیال رہے کہ جو literal معنی ہیں وہی بلا چون و چرا قابل یقین ہیں۔ اس شغل پر کچھ محنت صرف کی جائے تو detachment کی راہ خود بخود ہموار ہو جاتی ہے..... اشفاق سے بھی کہیں کہ اپنی تباہ تر مصروفیات کے باوجود وہ بھی اس شغل کو تھوڑا تھوڑا پٹانے کی کوشش کرے.....“

میں نے جو کچھ شہاب بھائی سے پوچھا وہی اسی سوال شہاب مجید نے بھی کیا تھا کہ

کون اللہ کے فضل کا حقدار ہے یہ لائری کیسے نکلتی ہے؟ اس کے متعلق ایک بار شباب بھائی نے شیماجید کو بھی خط لکھا تھا۔

اسلام آباد

۱۸ دسمبر ۱۹۸۲ء

محترمہ عزیزہ شیماجید صاحبہ

آپ نے پوچھا ہے کہ جو علوم محض اللہ تعالیٰ کے فضل سے ملتے ہیں، انسان کو ان کا امیدوار کیسے رہنا چاہئے۔ اللہ تعالیٰ لائری کیسے نکالتا ہے؟ اور اس کا علم انسان کو کیسے ہوتا ہے؟

اللہ کے فضل کا حقدار تو کوئی نہیں کہلاتا۔ لیکن امیدوار سب کو اس طرح رہنا چاہئے جس طرح لائری کا ٹکٹ لے کر یقین تو کسی کو نہیں ہوتا لیکن گمان سب کو رہتا ہے کہ شاید میرا نمبر ہی نکل آئے۔ لائری کی تشبیہ کو ذرا سمجھ کر بات مزید صاف ہو جاتی ہے۔ لائری کا انعام نکلنے کی امید اسی کو ہو سکتی ہے جس نے لائری کا ٹکٹ لیا ہو۔ جس نے ٹکٹ ہی نہ لیا ہو وہ اگر انعام کی توقع لگا کر بیٹھ جائے تو یہ اس کی حماقت ہے۔ اللہ کے فضل کی لائری کا ٹکٹ اللہ کی عبادت اور معرفت ہے جو لوگ یہ ٹکٹ حاصل کر لیتے ہیں ان کے فضل کو لائری کے انعام کی امید لگانے کا حق پہنچتا ہے۔

اللہ تعالیٰ اپنے فضل کی لائری کیسے نکالتا ہے اس کا علم تو فقط اسی کی ذات کو ہے۔

اس کا علم انسان کو کیسے ہوتا ہے، ہر ایک کو اپنی اپنی استعداد اور درجہ اور مقام کے مطابق اپنے علوم کا پیمانہ خود بخود اپنے آپ پر منکشف ہوتا رہتا ہے اس کے اپنے نور باطن سے ایسی چیزیں اور باتیں معلوم اور محسوس ہونے لگتی ہیں جو نہ دوسروں کو معلوم اور محسوس ہوتی ہیں اور نہ دوسرے عام ذرائع سے معلوم اور محسوس ہو سکتی ہیں۔ اگر کبھی ایسی کیفیت وارد ہو تو اسے ہر کس و نا کس پر ظاہر نہیں کرنا چاہئے۔ البتہ اگر کسی سے باطنی اور روحانی تعلیم و تربیت کا رشتہ قائم ہو تو اس سے ہر گز چھپانا نہیں چاہئے کیونکہ کبھی ایسی واردات تصور راقی ہوتی ہیں یا متخیلیہ کی کرشمہ سازی ہوتی ہیں اور انسان انہیں نور باطن سمجھ کر گمراہی میں مبتلا ہو جاتا ہے۔

حقیر

قدرت اللہ شباب

عبادت کے سلسلے میں بھی شباب بھائی نے شیماجید کو خط لکھے تھے۔

مری

۶ جون ۸۳ء

محترمہ عزیزہ شیماجید

عبادت بھی اللہ تعالیٰ کی خوشنودی اور رضا کے حصول کے لئے کی جائے اسی عبادت میں اصلی خلوص پیدا ہونے کی صلاحیت بدرجہ اتم موجود ہوتی ہے اس کے علاوہ جو عبادت ذاتی، یادنیادی یا دیگر مقاصد یا مرادوں کو پورا کرنے کی غرض سے کی جائے اس میں خلوص پورا نہیں ہوتا.....

حقیر

قدرت اللہ شباب

پھر ایک اور خط میں اسی مضمون پر فرمایا

اسلام آباد

۲۳ ستمبر ۸۳ء

محترمہ عزیزہ شیماجید

اسلام علیکم

ڈاکٹر اجمل نے مولانا اشرف علی کے حوالے سے شخصی دعا کے متعلق جو لکھا ہے وہ میں نے نہیں پڑھا۔ البتہ شخصی دعا سے غالباً یہی مقصد ہو گا کہ انسان براہ راست اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں خضوع و خشوع سے اپنی فریاد کرے، ایسا کرنے میں کسی خاص صلاحیت کی ضرورت نہیں ہے اللہ تعالیٰ کا دروازہ ہر کس و نا کس کے لئے یکساں کھلا ہے ہاں جو لوگ عام طور پر اللہ کی عبادت اور ذکر کرنے کے خوگر ہیں انہیں باری تعالیٰ کے ساتھ شخصی رابطہ استوار کرنے میں اجنبیت محسوس نہیں ہوتی دوسروں کو کسی قدر ہچکچاہٹ محسوس ہوتی ہوگی لیکن اللہ تعالیٰ کی طرف سے راستہ سب کے لئے کھلا ہے.....

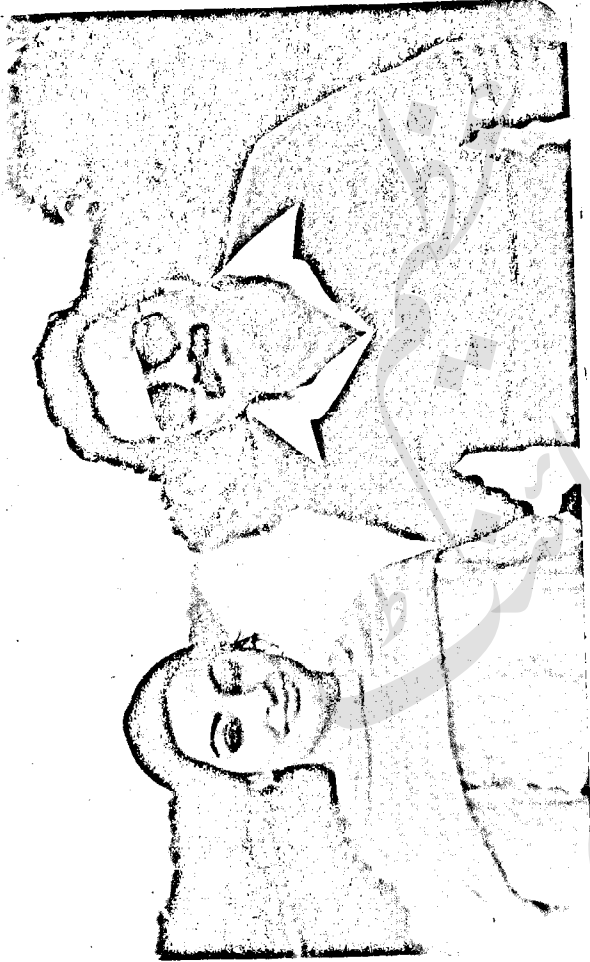
دعا گو

قدرت اللہ شباب

شباب بھائی وارفتگی کے آدمی نہیں تھے وہ جذبات کو عین معمول پر لانے کی کوشش کرتے۔ ان کا خیال تھا کہ انسان کی خوبی ہی بعض اوقات اس کی خرابی، اور اس کی خرابی ہی بیشتر نجات کا باعث بن جاتی ہے۔ نئی انسان کو دنیا میں قابل تعریف شخصیت ہے لیکن یوں بھی دیکھنے میں آیا ہے کہ سخی کی بیٹی غلط راستے پر بڑی اور اس کا بیٹا مانگتے پر مجبور ہوا اور ذلت کی زندگی گزارنے لگا۔ چور اپنے اعمال کو دیکھ کر استغفار کی سیرجی پر چڑھ گیا اور قطب کسلا یا۔ وہ کہا کرتے تھے کہ جس قدر اپنی کوتاہیوں، خرابیوں پر پشیمان ہونے کی ضرورت ہے اتنا ہی اپنی بھلی عادتوں، نیک خصلتوں اور خوبیوں سے بچنے کی بھی ضرورت ہے۔ اپنی خوبی کا احساس کئی بار تکبر کی شکل اختیار کر لیتا ہے اور تکبر ایک ایسی آگ ہے جس میں اچھائی برائی سب بھسم ہو جاتی ہے۔ بس حیا اور مجزود اچھے وصف ہیں یہ ساتھ ہوں تو نہ اچھائی تکبر بنتی ہے نہ برائی لے ڈوبتی ہے اور ان کے اس وصف کی مجھے آج تک سمجھ نہیں آئی کہ یہ اچھائی ہے کہ برائی۔

جب یہ چھوٹے تھے تو خان صاحب کے لئے لاہور کے قلعے سے ایک شخص مہاتما بدھ کا چھوٹا سا مجسمہ لایا، یہ مورتی صرف مہاتما کے سر کی تھی۔ میں نے یہ مجسمہ بچوں کے کمرے میں کھڑکی میں رکھ دیا۔ کبھی کبھی جب انیق خاں گہری نیند سویا ہوتا۔ تو مجھے نیم اندھیرے میں اس مجسمے اور اس کی صورت میں بڑی مشابہت نظر آتی۔ مجھے خوف رہنے لگا کہ راجہ گوبلی چند کی طرح ایک دن میرا یہ بیٹا کیسے کسی برگد تلے نہ جا بیٹھے۔ آپ جانتے ہیں ہر عورت سوتن سے کیسے زیادہ چھپے ہوئے رب کی کشش سے ڈرتی ہے جو اس کے پیاروں کے کان پھڑا کر ہاتھ میں کاسہ پکڑا تا اور کانٹوں کا تاج پہنتا ہے ایسے میں ماں کے دل پر جو بیت جاتی ہے اس کا کسی دلی اور قطب کو گمان بھی نہیں ہو سکتا۔ اسی مشابہت سے خوفزدہ ہو کر میں نے پہلے انیق کو ٹینس کھیلنے پر لگایا۔ پھر ہارمونیم کے ساتھ گانے کے لئے ابھارا۔ طلبہ سکھانے کے لئے ماسٹر لگایا اور بھانت بھانت کے مشغلے اس کے ارد گرد بکھیر دیئے۔ لیکن انیق کے چہرے پر پھیلی ہوئی محبت بھری شانتی میں خوف کی کمی نہ آئی۔ پھر وہ کچھ بڑا ہوا اور انگریزی میں نظمیں لکھنے لگا تو میں اور بھی خوفزدہ ہو گئی جب تک اندر راجہ گدھ لونہ چوستا ہوا دب تخلیق نہیں ہو سکتا۔ میں نے اسے ادب کی پٹری سے اتار کر سکرپٹ رائٹر بنانا چاہا لیکن وہ اپنے والدین کی شہرت دیکھ کر اور اس سے جنم لینے والے مسائل سے خوفزدہ ہو کر اس دشت کی پسپائی میں اترتا نہیں چاہتا تھا۔ انیق خاں ان دعوت ناموں کو پسند کرتا جو تواتر سے ہمارے گھر آتے ان ایوارڈوں کو تحسین کی نگاہ سے دیکھتا جو ہمیں ملنے لگے لیکن کیمروں کی روشنیوں، بڑی بڑی محفلوں میں خود پسندی اور خودیگرائی کی باتیں، اپنے آپ کو تانیا تو ملی سمجھ کر دوسروں کو گندی مکھی بنانے کا فن، بڑی عمر کے سیلف میڈ آدمیوں کی فرعونیت انیق کو ناپسند ہے۔ اندر ہی اندر گمنامی، شانتی، خاموشی، دوسروں کے لئے بے ضرر رہنے کو پسند کرتا ہے۔ اسے بڑی محفلیں، اونچے بیان، بڑی عمر کے مرد بہت گڑبڑا دیتے تھے۔

پھر ایک روز یوں ہوا



ایک اچھا ہوتا نہ دوسرا برا..... بس دونوں مختلف ہوتے ہیں۔ مختلف گھروں کی پیداوار آہستہ آہستہ جس طرح بچہ دانت نکلنے پر سخت سے سخت چیز کھانے لگتا ہے ایسے ہی میاں بیوی چند ابتدائی سالوں کے بعد مشکل مقامات پر بڑے تھوڑے رد عمل کے ساتھ عبور پالیتے ہیں.....

ایق خاں نہ صرف کمرے سے خوش نکلا بلکہ شادی کی ابتدائی تکلیفوں سے نلوہ بچ گیا اور خوشی خوشی شادی بتانے لگا۔

جس وقت شباب بھائی کا وصال ہوا۔ ایتق خاں پاکستان میں نہ تھا واپسی پر جب انہیں سارے واقعات غزل نے سناے تو ایتق خاں خاموش ہو گئے بڑی دیر بعد بولے.....

”شباب چچانے میرے ساتھ اچھا نہیں کیا پہلے بیعت نہ کرنے دی۔ پھر اب جبکہ ان کی ضرورت اتنی زیادہ تھی ہمیں یوں چھوڑ کر چلے گئے“..... اس کے بعد ایتق خاں کئی دن کرسیوں پر قایلین پر اپنے کمرے میں برآمدے میں، پلنگ پر ڈھیر سا بیٹھا نظر آتا جیسے وہ اندر ہی اندر کسی جگہ سو پزل کو دوبارہ تشکیل دینے میں مشغول تھا۔ پھر ایک روز ایک نظم اس کے پلنگ کے پاس تپائی پر پڑی نظر آئی، میں جلدی میں تھی پڑھ کر محفوظ نہ کر سکی۔ ہوا میں اڑی چند دن دروازے کے پاس کوٹنے میں رہی۔ جھاڑو کے ساتھ سمندر رونے سے کمرہ بدر کرنا چاہا۔ میں نے اسے اٹھا کر پڑھا لکھا تھا۔

شاید کل ہی اچھی گزرے
شاید موسم اچھا ہو
شاید دھند کے پردے میں سے
چڑھتا سورج پورا ہو
شاید بے کل، کل نہ ہووے
شاید رستہ چھوٹا ہو
شاید باغ در پہنچے میں اک
جانا جانا چہرہ ہو
شاید رت رنگیں ہو جائے
شاید بادل چھایا ہو
شاید میرے شور کے اندر
اک سناٹا غالب ہو
شاید سب کو واہمہ گزرے

ایق احمد خاں ایف سی کالج میں سائیکلو جی پڑھانے لگے۔ چونکہ ہمارے گھرانے میں تمام کام جوش، دلوے اور درستی سے کرنے کا رواج ہے۔ اس لئے وہ بھی دنیا و دین چھوڑ کر صرف شاگردوں کی زبان سمجھتا تھا۔ ان دنوں طائف میں مقیم ایک سائیکلو جسٹ لائبر آئے ہوئے تھے۔ ان سے ایتق خاں ملا تو معلوم ہوا کہ طائف میں قرآنی آیات کے ساتھ ذہنی بیماریوں کا علاج کیا جا رہا ہے اور اسی ضمن میں سانگی ایٹری کی ایک انوکھی برانچ وہاں کھل گئی ہے۔ ایتق خاں بھی چنگتی آنکھیں اور ولولہ انگیز پلانوں کے ساتھ گھر لوٹے..... ان کا خیال تھا کہ وہ بھی طائف جائیں اور ذہنی املا میں مبتلا کا علاج اسی طور پر کریں۔ شباب بھائی کریمپ سول کے جوتے پہننے میں مشغول تھے..... ایتق خاں کی بنائی ہوئی چھڑی ان کے پاس دھری تھی وہ بڑی توجہ سے بظاہر ان سے انداز میں ایتق خاں کی باتیں سنتے رہے۔ ایک بار بھی انہوں نے ان پر جوش باتوں پر ٹھنڈا چھیننا نہ مارا..... بالآخر ایتق خاں نے پوچھا.....

”شباب چچا کیا واقعی ایسے ممکن ہے؟ کیا قرآنی آیات سے علاج ہو جاتا ہے؟“

”ہاں کیوں نہیں..... بالکل ہو جاتا ہے۔“

”تو کیا میں طائف چلا جاؤں؟..... ایک بڑے مشن میں شامل ہو جاؤں.....؟“

شباب بھائی بڑی دیر چپ رہے جیسے اپنے مشورے کی نیچر کو آنک رہے ہوں پھر بولے.....

”میرا تو خیال ہے تمہیں نہیں جانا چاہئے کیونکہ یہ قرآنی آیات کا صحیح استعمال نہیں۔ قرآن دراصل روح کے سفر کے لئے ہے۔ دنیا بھی ساتھ ساتھ سنو تری ہے۔ لیکن اسے کسی صورت بھی کمرشل و نیچر سے وابستہ نہیں ہونا چاہئے۔“

وہ جانتے تھے کہ عام انسان کا ایمان کمزور ہوتا ہے اگر کسی دن..... کسی وجہ سے کسی آیت سے علاج نہ ہو سکا تو عین ممکن ہے کمزور ایمان والے کا زیادہ ہی نقصان ہو جائے لیکن ڈھیلی سی آواز میں بغیر اصرار کے شباب بھائی نے جو مشورہ دیا ایتق خاں نے اس پر عمل کیا اور طائف نہ گئے۔

یوں تو میرے قیٹوں بچے وقتاً فوقتاً ان کے ساتھ بیٹھ کر باتیں کیا کرتے تھے لیکن کبھی کبھی وہ بند کمرے میں شباب بھائی سے کچھ ڈھکی چھپی باتیں بھی کرنے جاتے جن کا سراغ ہمیں کبھی نہ ملتا..... شباب بھائی کے جانے کے قریباً سال بھر بعد ایک دن ایتق خاں نے بتایا۔

”میری شادی کے بعد میں نے محسوس کیا کہ غزل اور میں بالکل مختلف ماحول کی پیداوار ہیں۔ ہمارے خاندانی کلچر ایک سے نہ تھے۔ اس کی سوچ اور میری سوچ میں بڑا ہی بُد تھا۔ اسی کشمکش میں ایک روز میں شباب چچا کے پاس گیا اور لجاجت سے عرض کی کہ یہ گاڑی مجھ سے تو چلتی نہیں آپ بتائیں کیا کریں۔“

ارشاد ہوا.....

”شادی کے چند ابتدائی سالوں میں Teething troubles ہوتی ہیں۔ دو مختلف انسان ملتے ہیں۔“

شاید پاگل راضی ہو
شاید خود سے باتیں کر کے
اپنا خواب ہی سمجھا ہو

شباب بھائی کے جانے کے بعد آنے والی کل کا خوف پھر اس پر غالب آ گیا تھا۔ انیس خاں آنے والی کل سے خوفزدہ نہیں.... گزری ہوئی کل کا زخم خوردہ ہے۔ غل غپاڑہ بھائی، چپ چاپین گزرتی، ہنستی کھیلتی، ادا اسی نراسی، بدلی کی طرح سبک، آندھی جیسی شہ زدہ ڈالیاں ہلاتی، گرد اڑاتی ہر گزری ہوئی کل اپنا سارا موڈ، آوازیں، رنگ ایک پورا پروگرام مونیٹر کر کے انیس کے اندر پھوڑ جاتی ہے۔ پھر وہ آنے والی کل کی بند مٹھی کو کنس دیکھتا.... لاری کی طرح ان دھوئے ان پھوئے سفید دوشے کو گزرے ہوئے رنگوں میں رنگنے لگتا ہے مونیٹر شدہ پروگرام اسے بے خونی سے آنے والی کل کا سواگت ہی کرنے نہیں دیتا....

وہ لمبے چوڑے شکوے شکامنتیں، چھوٹی چھوٹی فردی باتیں بڑے شوق سے کرتا ہے لیکن خان صاحب کی طرح اصلی بات کو چھوٹی بڑی باتوں تلے چھپائے رکھتا ہے۔ تو خم پھاڑ کے چمیل سینے پر بغیر بندوق کے چلنے والا انیس خاں ان ساعتوں کی نگرانی کرتا ہے جن میں کبھی اسے خوشی ملی۔ خوف جیسے دشمن سے وہ ان چمگی پونوں کو چھپانا پنا فرض بھی سمجھتا ہے۔ اس میں اپنے باپ دادا کی رو حیں رہتی ہیں۔ جو بڑی بغیرت سے زندگی بسر کرتی ہیں، اور غیرت کو ڈھال بنا کر آگے بڑھتی رہتی ہیں۔

وہ مذاق کرتا ہے لیکن شوخ چشم نہیں.....

وہ پیاروں کی نگرانی کرتا ہے لیکن اظہار سے خوفزدہ رہتا ہے کہ کہیں یہی اظہار ہتھیار بن کر اس کے خلاف استعمال نہ ہو.....

وہ قریب آنا چاہتا ہے لیکن پاس آ کر بن خستہ ہو جاتا ہے کیونکہ پذیرائی کا شوق پہلے ہی خوف نے کند کر رکھا ہے۔ انیق خاں کے خوف ان جانے ان دیکھے Fear of the unknown سے لڑتے ہیں انیس خاں کا خوف جانے پہچانے، کیڑا لگ میں درج، ٹیپ شدہ، سری کی شکل میں تیار پہلے سے ہی لال بتی جلانے والے ہوتے ہیں اور ہمیشہ اسے پیچھے کی طرف دھکیلتے ہیں۔ دونوں وقت کے دھارے پر تھر تھر کانپتے بادبانوں کے ساتھ چلتے ہیں۔ دونوں احتیاط سے قدم پھونک پھونک کر رکھتے ہیں۔ اور اپنی کسی غلطی کو معاف نہیں کرتے ایک دفعہ یوں ہوا.....

رات کا وقت تھا۔ انیس خاں پچھلے ہی بلاک میں سائیکل پر سوار بیڑی کے سیل خریدنے گئے کچھ دیر کے بعد بظنی گلی میں وھڑام سے سائیکل گرنے کی آواز آئی۔ ہم سب باہر لان میں بیٹھے تھے۔ اس شور پر سب کے کان



کھڑے ہو گئے۔ اب انیس خان بھاگا ہوا آیا۔ اس وقت وہ نوبالغ تھا۔ آتے ہی اس نے کہا..... ”میں سی بلا کر کے رہا تھا کہ کچھ لوگ عجیب و غریب لباس پہنے مجھے ڈرانے آئے..... میں میں..... میں“ اس کا چہرہ ہراس سے زرد تھا..... اس کی آواز میں لغزش تھی وہ اپنا تجربہ پورے کا پورا بیان کرنے سے قاصر تھا۔ میں اسے تسلی دینا چاہتی تھی لیکن مجھے معلوم تھا وہ ایسے لمحات میں ہمدردی کو قبول نہیں کر سکتا۔ وہ دہشت کے نرغے میں تھا لیکن اس کے ساتھ ہمدردی کرنا بھی ممکن نہ تھا.....

اب انیس رات رات جاگنے لگا وہ دوسری منزل میں ریکارڈنگ روم کے اندر تین تین بجے تک بیٹھا رہتا۔ سگرٹیں پیتا اور خوفزدہ رہتا..... میں اوپر جانے والی سیڑھیوں تک جاتی چوری چوری ادھ کھلے دروازے میں سے سگرٹ کے دھوئیں کو دیکھتی۔ اس کا خوف عبادت کی طرح مقدس تھا۔ غل ہونے کی گنجائش نہ تھی..... جب اس کی شادی کی بات چلی اور ہمارے گھر میں ہر گھر کی طرح جھگڑے پڑے تو میں اس کی رائے بھی معلوم نہ کر سکی۔ خاں صاحب اس رشتے پر رضامند نہ تھے اور مجھے یہ خوف تھا کہ انیس اس درجہ خوفزدہ ہے کہ اپنی اصلی خواہش کا کبھی بھی اظہار نہ کرے گا.....

پھر یوں ہوا.....

اسلام آباد میں شہاب بھائی پبلی فورڈ چلا رہے تھے مفتی جی میرے ساتھ پچھلی سیٹ پر اور سامنے خان صاحب شہاب بھائی کی بغلی نشست پر بیٹھے تھے..... سڑک کے کنارے ایک پھل والے کی دوکان پر رک کر خان صاحب اور شہاب بھائی پھل خریدنے اتر گئے۔ مفتی جی بولے ”قد سو۔ جب کبھی شہاب پھل کی دوکان پر میرے ساتھ جاتا ہے میں اسے ضرور اپنے لئے پھل خریدنے کو کہتا ہوں۔ تم بھی اس سے مانگا کرو..... مانگو.....

مانگو..... برکت ملتی ہے.....“

برکت اور مانگنے پر بڑی دیر تک باتیں ہوتی رہیں پھر مفتی جی بولے..... ”اوئے تم اندھے ہو ٹولید اور انیس کی شادی کیوں نہیں کر دیتے؟.....“

میں چپ رہی

”میں جانتا ہوں وہ تیرا بھائی نہیں مانتا..... اور دوسرا انیس پشیمان اتنا خوفزدہ ہے کہ وہ اظہار نہیں کرتا لیکن اس سے بہتر لڑکی کہاں ملے گی؟“

میں پھر بھی چپ رہی.....

”اچھا میری نہ مان..... شہاب سے بات کر.....“

میں شہاب بھائی کے پاس گئی دوڑاؤ بیٹھی لیکن مجھے کچھ کہنا نہیں پڑا.....

نہ رشتے کے سلسلے میں نہ خان کی ناراضماندی کے بارے میں نہ انیس خاں کی سفارش کے ضمن میں۔

ارشاد: را.....

”خوفزدہ ہونے کی کوئی بات نہیں سب کچھ اللہ کی رضا پر چھوڑ دیں۔ آپ دیکھیں گی ہر صورت میں وہی ہو گا جو آپ چاہتی ہیں.....“

”آپ دعا کریں؟“ میں نے لجاجت سے کہا ”ہاں میں دعا کروں گا“ میں نے ان کی دعا کے بعد اللہ کی رضا پر کچھ نہ چھوڑا ”اور وہی ہوا جو میں چاہتی تھی۔

دراصل شہاب بھائی ایسا پنڈولم تھے جو ہمیشہ درمیان میں رہتا ہے۔ ان کے ارد گرد سب شدت پسند تھے کبھی دائیں کبھی بائیں..... لیکن وہ عین وسطے میں رہتے تھے۔

ان کے دوست رشتہ دار سب ان کا شٹ تھے لیکن ان شدتوں کی وجہ سے انہوں نے کبھی کسی کو نہیں چھوڑا کسی کو نہیں ٹوکا کوئی نصیحت نہیں کی بلکہ صرف یہی امید رکھی..... ”اللہ نے چاہا تو سب ٹھیک ہو جائے گا.....“

وہ کہا کرتے ہیں کچھ لوگ ایسے بھی دنیا میں ہوتے ہیں۔ جن کا Wishing ہی Willing ہوتا ہے۔ ایسے ہی کچھ لوگوں میں ان کا شمار بھی تھا۔ جب وہ نیک نیتی سے آپ کے لئے دعا کر دیتے تو آپ کا کام فوراً ہو جاتا۔ ان کی دعا سے ایسے ہی انیس اور ٹولید کا کام بن گیا۔ اب انیس خاں اس نکاح نامے کی بہت حفاظت کرتا ہے جس پر کیو پڑ شہاب کے دستخط ہیں۔ وہ کچھ کو بتاتا تو نہیں لیکن اس کا خیال یہی ہے کہ بابے ہی اس کی کشتی کھے رہے ہیں۔ بابے ہی اس کے ہم سفر ہیں۔ بابے ہی در پردہ اس کی بگیاں بناتے ہیں۔ اگر بابے اس کے ساتھ نہ ہوتے تو اب تک خوف کے گولے نہ جانے اسے کہاں اڑالے جاتے..... جیسے کئی سال اس کے چھوٹے بھائی اشیر کو خوف کا بگبگرا بھگائے لئے پھرتا رہا.....

خواہشوں کی رسم کبھی عموماً لوگوں کو ایسے بیروں کی طرف لے جاتی ہے جو گنڈے تعویذ سے عمل اور دعا سے خواہش پوری کرنا جانتے ہیں..... خواہشات کے حصول کے لئے پیر پکڑنا اور بالآخر ایسے پیر کو جو تلاش حق میں ابھی خود کمزور ہو ڈیہ پیر بنا کر لوگوں کا ضرورت مند بنا دینا ایسے ہی خواہش مند لوگوں کا کرشمہ ہے..... جس طرح خواہش کا اجتماع دنیا میں کرپشن کے دروازے کھولتا ہے ایسے ہی مقدمہ، محبوب کی واپسی، بیٹے کی نوکری، شوہر کا موت سے چھٹکارا، امتحانوں میں کامیابی، دشمن زربا، قرضے سے نجات، حصول دولت وغیرہ جب طاقت، روپے، رشوت، سفارش سے اپنے اختیار میں نہ آسکیں تو عام دنیا دار پیر کے دروازے پر پہنچتا ہے لیکن وہ اپنی کرپشن ساتھ لے کر جاتا ہے اب پیر پر دولت، نذرانے، خدمت کا اثر ہونے لگتا ہے۔ خواہش پوری ہونے ہو..... کرپشن ضرور اثر دکھاتی ہے۔

کچھ لوگ حصول علم کی خاطر بیروں کی چلمیں بھرتے ہیں ان کی عقل ان کو ہر اسال رکھتی ہے وہ ”جاننا“ چاہتے ہیں۔ دین ان کے لئے جیو میٹری، الجبرے کا سوال ہے جس کا حل ہونا ضروری ہے۔ وہ قاتل رستے اور قاتل ہونے کے لئے بابوں کے پاس جاتے ہیں۔ ذہین، پر مغز تائیں ان کی عقل کو خیرہ کرتی ہیں۔ کسی بزرگ سے دین کا علم اخذ کرنا اور پھر اسے دوسرے کم علم کمزور لوگوں پر لاٹھی، رسی، چوب، ہتھکڑی، زنجیر

بندوق کے طور پر استعمال کرنا ان کا محبوب مشغلہ ہوتا ہے۔ کسی بابے سے چرایا ہوا علم عام آدمی کو دانشوری کی ایک جداگانہ سند عطا کرتا ہے۔ اس Seat of learning کے سارے نہ صرف وہ اپنی کرسی ادنیٰ کر سکتا ہے بلکہ دوسروں کے پائے بھی کاٹ سکتا ہے۔

چند ایسے لوگ ہوتے ہیں جن کی زندگی نے پذیرائی نہیں کی ہوتی۔ وہ جہاں کہیں بھی جائیں گے گول سوراخ میں چوکور، میخ بن کر وقت گزاریں گے۔ کسی کو ان کی کوئی خاص پروا نہیں ہوتی۔ کوئی ان کی خاطر نہ انتظار کرتا ہے نہ آنسو بہاتا ہے۔ انہیں ہیروں کے کتورے بننے میں ایک خاص قسم کی لذت ملتی ہے۔ تنہا خدا والے ہو جانا..... کسی کو بھی belong نہ کر سکنے کی اذیت سے نکل کر وہ ساری خدائی کو own کرنے لگتے ہیں۔ ایسے تنہا ادا اس اداس چہرے ڈیروں پر بڑے فعال ہوتے ہیں اور سب کو لنگر کھلاتے ہیں چٹائیاں، بچھاتے ہیں۔ لوٹے بدھنیاں قطار میں لگاتے ہیں..... نلکوں پر لمبی ٹانگیاں باندھتے ہیں تاکہ پانی کے چھینٹے نہ اڑیں۔ جوتیاں قطاروں میں آراستہ کرتے ہیں اور ڈیرے پر ان کی اہمیت دن بہ دن بڑھتی جاتی ہے اور کم ہانگی کم ہونے لگتی ہے۔

کچھ لوگ ”ہیرو ورشپ“ کے بغیر زندگی بسر نہیں کر سکتے وہ ہمیشہ صاحب کمال لوگوں کے پیچھے چلنے میں راحت محسوس کرتے ہیں۔ نامور موسیقار، اچھے ادیب، قابل ڈاکٹر، رواں خطیب، بلکہ یوں سمجھئے کہ اپنے سے بہتر انسان کی ایک جھلکی دیکھ کر یہ لوگ اس کی بڑائی کی نہ صرف تعریف کرتے ہیں بلکہ ایک طرح اسی کی بڑائی کو Simulate کر کے اپنی زندگی بسر کرتے ہیں۔ ایسے لوگ عموماً اپنی خواہشات، ان کے حصول اور بعد کی مایوسی سے تنگ آکر اللہ کے نیک بندوں کے حضور بیٹھے رہتے ہیں۔ انہیں یہ بات تیر میں لے جاتی ہے کہ خواہشات کے بازار میں سے گزرتے، دے فقیر لوگ کیسے خواہشات کے دباؤ سے آزاد رہتے ہیں؟ عورتیں عام طور پر بھگت کے آشرم، فقیر کے ڈیرے، گمروے کپڑے والے شنیاسی کے حضور، ہرے چوٹے میں ملبوس درپوزہ گر کے سامنے بڑی عاجزی سے حاضری دیتی ہیں۔ دنیا چونکہ عورت کے بغیر چلتی نہیں اور یہ عارف دنیا آخری سانس تک کسی نہ کسی بچے پوتے کے لئے دنیا ہی مانگتی رہتی ہے اس لئے ڈیروں پر جاکر عورت غیر شعوری طور پر تیر میں چلی جاتی ہے۔ یہاں سے ”ہیرو ورشپ“ کا مکمل چانس ملتا ہے۔ آرزوؤں سے لدی پھندی وہ خواہشات کے پھل پتے چھڑے درخت کو دیکھ کر حیران رہ جاتی ہے..... پھر جس رقت، عاجزی حیرانی سے عورت ہیرو ورشپ کرتی ہے کبھی کبھی اس جذبے سے بھگت کے تنہی ساری طنائیں اکھڑ جاتی ہیں، اور وہ عارف موٹی نہیں رہتا..... گرہست آشرم میں قدم دھر کر آہستہ آہستہ عارف دنیا بن جاتا ہے۔ اللہ اپنے پیاروں کو عورت سے اس لئے نہیں بچاتا کہ خدا خواست وہ جیسا ہے یا وہ مرد عورت کی محبت کو اپنے لئے خطرہ سمجھتا ہے بلکہ خدا وجود کے گناہ سے اپنے فقیر کو فقط اس لئے بچاتا ہے کہ ایک بار عورت کا ساتھ ہو جائے تو پھر ہر مرد گھونٹا بنائے، کھڑکیاں دروازے رکھے، سودا سلف لانے پر مجبور ہے..... عورت کا کفیل ہو کر وہ اللہ کا آزاد چچی

نہیں رہ سکتا..... دنیا کا رخ کرتے ہی بسیط فضاؤں میں اڑنا ممکن نہیں رہتا..... بھگت ایک کھونٹے سے بندھ کر چھوٹے چھوٹے ناخنوں سے گھاس کھودتا رہتا ہے اور آزاد پرندوں کی طرح اڑنا بھول جاتا ہے..... عرفان ذات اور عرفان حق کا مسئلہ بھی کچھ لوگوں کو درپیش رہتا ہے.....

ان کے اندر کچھ سوالات کیڑوں کی طرح کربل کربل کرتے ہیں۔ وہ اپنے وجود سے لے کر اللہ کی ذات تک سمجھی اور نا سمجھی کے الاؤ میں جلتے ہیں۔ کبھی وہ دانشوروں کے گردہ میں بھٹکتے ہیں۔ کبھی کتاب ان کا آستانہ بن جاتی ہے اور کبھی وہ صاحب عرفان کی دہلیز پر جا بیٹھتے ہیں۔ اگر کچھ مسئلوں کا شافی جواب مل بھی جائے تو کچھ اور زمین دوز مسئلے سر اٹھالیتے ہیں۔ اس طرح پہلی لو گھٹتے ہی دوسری لو کا انتظار شروع ہو جاتا ہے۔ یہ لوگ کئی چہرے، کئی آستانے، کئی ڈیرے، کئی بابے اور کئی کیفیتوں کی الجھنوں سے نکل کر بھی سوالوں میں گھرے رہتے ہیں۔ کیونکہ ان کے اندر تحقیق کے بغیر جاننے کی صلاحیت نہیں ہوتی۔

کہتے ہیں کہ جتنے نفس پیدا ہوتے ہیں اتنے ہی راستے اللہ کی جانب نکلتے ہیں۔ جس قدر ڈھونڈنے والوں کی نہیں ہیں اتنی ہی راستہ دکھانے والوں کی بھی ہیں۔ کچھ لوگوں نے آسانی کے لئے پیروں کو بھالی اور جلائی کے دوپٹوں میں تقسیم کر رکھا ہے لیکن مزاج کے اعتبار سے یا مسلک کے حساب سے پیر کو کسی بریکٹ میں بند نہیں کیا جاسکتا۔

کچھ فقیر جوانی میں عشق مجازی کی ٹھوکر کھا کر ایسے دل برداشتہ ہوتے ہیں کہ پھر انہیں ساری دنیا ٹھکرا کر ایک اللہ کی ذات کا تکیہ رہ جاتا ہے۔ ایسے بھگت عموماً بھالی ہوتے ہیں۔ شہروں سے باہر جاڑ میں رہتے اور فطرت سے پیار کرتے ہیں۔ ان کے ڈیروں پر ڈوگر، کتے، بلیاں ہوتی ہیں۔ اگر ڈیرہ منظور نہ کریں تو پھر یہ نگری نگری پھرتے ہیں جو ملا سو کھا گزرے نہ ملا تو پڑ رہے۔ ایک بار مانگ کر ایسے تجربے سے گزر چکے ہیں کہ پھر مانگنے کا تجربہ نہیں دوہراتے۔ ان کی واحد محبت پھیل کر سمندر کی لہروں جیسی دور دور تک دائرے بناتی جاتی ہے۔ مخلوق ان کی تلاش میں بالکل دیسے رہتی ہے جیسے یہ کبھی اپنے مجازی محبوب کے دیدار کے لئے دیوانہ وار پھرتے تھے۔ یہ محبت کایک بڑا اگر ڈشیشن بن جاتے ہیں جس سے کئی علاقے کئی بستیاں روشن ہوتی ہیں۔ ان کی باتوں سے راضی برضا رہنے کی خوشبو آتی ہے۔ ان کے چلنے پھرنے میں عاجزی عبادت میں اللہ سے وصل کی خواہش ہوتی ہے۔ یہ خلق سے چھپ کر بسرام کرنا چاہتے ہیں مگر لوگ انہیں ڈھونڈ نکالتے ہیں پھر حُب کے تعویذ، نانچھ عورت کا علاج، ٹھڑے دوست کی واپسی، کشمہ بیٹے کی تلاش کے لئے ان کا کما تیر ہدف مانا جاتا ہے..... اپنی اگلی خواہش کا لہیان دے کر یہ خواہشات کے حصول کا راستہ بن جاتے ہیں۔ ان کی مجبوری دوسروں کی سرفرازی بن جاتی ہے۔

کچھ اللہ کے پیارے اپنے نفس کی تادیب کرتے کرتے ”احکامات کی پیروی“ کڑی کاوش اور بہت وظیفے اٹانے سے دن رات بسر کرتے ہیں۔ مٹھی بھر جو کھا کر چلو پھرتا پانی پی کر برس ہا برس گزارتے ہیں۔ ایسے

بھی ہر گھڑی کبھی طلوع آفتاب کے ساتھ، کبھی خوشبوؤں کو بکھر کر کبھی پھلوں کو پیش کر کے، کبھی پھولوں میں بس کر، آشیاروں کی صورت، جھرنوں میں جھلما کر خدا کے وجود کا اعتراف کرتی رہتی ہے۔ یہ لوگ بھی بڑی معصومیت سے، شور مچائے بغیر صرف اپنے وجود کے حسن سے لوگوں کو اللہ کی طرف بلائے رہتے ہیں۔

رجوع کرنے والوں میں سے ایک قسم وہ بھی ہے جن کا اللہ سے ”نیوں“ لگ جاتا ہے یہ سدا سا گئیں دن رات اسی کے نام کا دیا جلاتی، اسی کے جس گاتی رہتی ہیں۔ ان کے آنگن اس نام کے انتظار میں سلگتے اور ان کے تن میں اسی کے نام کے کیڑے پڑے رہتے ہیں، یہ مجذوب صفت لوگ کبھی خلق کی طرف راغب نہیں ہوتے کیونکہ لوگ ان کا وقت ضائع کرتے ہیں اور ان کے نزدیک جو دم غفلت میں گزرا وہی رائیگاں رہا۔

اللہ کے فقیروں میں وہ بھی چیدہ چیدہ لوگ ہوتے ہیں جنہیں اللہ اپنے لئے پسند کر لیتا ہے ان کے ماتھے پر لاث ہاتھ کی پوروں میں پکر، آتما میں آمند، شاقی ہوتی ہے یہ بچپن سے درود و سلام بھیجتے نا سبھی کی عمر سے فضاؤں کی رمزیں سمجھتے ہیں۔ ان کا وجود خوف اور حزن سے پاک ہوتا ہے، یہ دنیا، مصروفیات گرہست کو اپنے ستر کی طرح استعمال کرتے ہیں۔ بیرون میں جو کچھ ہوتا ہے اس سے ان کے اندر کو کوئی سروکار نہیں ہوتا۔ اندر ہمیشہ حمد و ثناء جاری رہتی ہے..... ان کا وجود محبت، عطر اور توکل کا مظہر ہوتا ہے۔

علیٰ ہذا القیاس.....

ذہونڈے والوں کی بھی ان گنت قسمیں اور پائے والوں کا بھی رنگ و رنگ وجود لیکن اشیر خاں ان میں سے کسی وجہ سے بھی شاب بھائی کے قریب نہ ہوا تھا۔

شاب بھائی کے وصال سے کچھ دن بعد میں نے خواب دیکھا کہ ایک بہت اونچا پہاڑ ہے جس کی بلندی نیلگوں دھند میں ملی جلی ہے۔ اس چھوٹی سی چوٹی پر ایک نھا منا پر سکون گھر ہے جیسے سویڈن یا ناروے میں ہوتے ہیں۔ اندر کمروں میں سرخ رنگ کا لمپ شیزر سرخارخ روشنی سے جگمگا رہا ہے۔ باہر ایک چھتارا ربو کا درخت لگا ہے جس کے نیچے ایک سفید بچہ پر شاب صاحب بیٹھ کچھ پڑھنے میں مشغول ہیں۔ پھر خواب کٹ نوکٹ ہو گیا۔ پہاڑ کے نشیب میں یوگی اشفاق ان کے تینوں بیٹے اور میں کھڑے ہیں۔ خاں زور سے آواز دے کر پوچھتے ہیں ”قدرت اوپر کیسے آؤں؟“

شاب بھائی ایک لمبی سی رسی نیچے پھینکتے ہیں اس رسی میں دو دو فٹ کے فاصلے پر موٹی موٹی گرہیں پڑی ہیں۔ پلٹی آواز دے کر شاب بھائی کہتے ہیں ”اشفاق اشیر کو سب سے پیچھے رکھنا تم میں سے اگر کوئی گرے گا تو وہ اسے سنبھال لے گا“۔ ہم پانچوں ہانپتے کانپتے پہاڑی کے اوپر پہنچتے ہیں۔ شاب

بزرگوں میں کبھی کبھی وہ چور بھی ہوتے ہیں جو قطب کے درجے کو سمجھتے ہیں۔ احساس جرم کی تاب نہ لا کر سیدھا کھڑے رہنے والا فقیر روحانی دنیا کا بڑا ہی طاقتور پہلوان ہوتا ہے، ان کی طبیعت عموماً جلالی اور دینے کا انداز بادشاہوں کی طرح ہوتا ہے۔ کبھی سلام کئے جانے پر رنجیدہ ہوتے ہیں اور بسا اوقات گالی دینے پر مغلعت بخش دیتے ہیں۔ یہ جن کو پھر ایمنٹ مار دیں جانے وہ پار ہو گیا جس کو تھپڑ جھانپڑ پڑ گئی، اس کی خواہش ٹھکانے لگی۔ جس طرح پہلوان کا کسرتی جسم طاقت میں عام آدمی سے زیادہ ہوتا ہے ایسے ہی ان کے روحانی ڈولے بڑے بڑے کارنامے کرتے ہیں ان کی بد دعا، سناہے، دعا سے بھی زیادہ سریع التاثر ہوتی ہے۔

کچھ فقیروں کو ابھی آدھی آج کی کسرت ہوتی ہے وہ کلی طور پر اپنی خواہشات پر ڈھکنا لگانے کا فن نہیں جانتے۔ ان کا نفس رسی سے ضرور بندھا ہوتا ہے لیکن رسی پورے شہر برابر لمبی ہوتی ہے۔ ایسے فقیروں کا تکبر بادشاہوں جیسا، گفتگو بظاہر کسرتی سے ڈھکی چھپی پر اندر سے ان کی سان پر چڑھی ہوئی، نیند کے ماتے، آرام کے رسیا۔ خلق خدا میں بیٹھے والے یہ فقیر لوگ دراصل روحانی دنیا کے نیم حکیم ہوتے ہیں۔ جس طرح راشی اور مرتی ایک دوسرے کے بغیر نہیں چل سکتے اور برابر کے گناہ گار ہوتے ہیں ایسے ہی خواہشات کے پیچھے دیوانے لوگوں کے بغیر ایسے ذہبیروں کا کاروبار نہیں چلتا۔ یہ لوگ تیسوں کی بیچ، خلق میں، ہر دم کھلے طے رہتے ہیں۔ شاید ان کی خواہش بھی اللہ کے ہاں سچی حضور سے ہی شروع ہوتی ہو، پر خواہشات سے عاجز آئے ہوئے بندے انہیں استغاثی میز می چڑھنے نہیں دیتے۔ رفتہ رفتہ ایسے ذہیروں کی شکل، رہن سہن، بالکل کسی متمول شخص جیسا ہو جاتا ہے۔ ذہیروں کے آگے گاڑیاں، کمروں میں ایئر کنڈیشنڈ، بچوں کی تعلیم انگریزی سکولوں کی، شہر کے تو کمروں سے میل ملاقات، لباس فیشن بنی ہوئے لگتا ہے۔ یہ نہیں کہ ان فقیروں کو اللہ کی تلاش نہیں ہوتی لیکن ان کا حال بالکل ویسا ہوتا ہے کہ یہ وہ تورنڈا پا کاتی ہے پر غنڈے کاٹنے نہیں دیتے۔ یہ توراہ مولار چلنے کے خواہشمند ہوتے ہیں پر لوگ انہیں قدم اٹھانے نہیں دیتے۔ یہاں بھی جھگڑا دال چپاتی کا سارا دن چلتا ہے اور خلق پیر کو اپنے ہی رنگ میں ڈھالنے میں کامیاب ہو جاتی ہے.....

کچھ بھگت نظریں نیچی کئے جوتیاں گانھتے، چار پائیاں بنتے، باڑھیں کاٹتے، ہائی کورٹ کے سامنے مسلیں لکھتے، چھپے چھپے اپنے اپنے رزق حلال کمانے میں مصروف پر اندر کی سمت نماز دست رکھتے ہیں۔ بنکوں میں، گھروں میں، سائیکلوں پر، کاریں چلاتے ہوئے، کالا کوٹ پہنے، بانیسوس گریڈ کے باوجود پیچھے پیچھے چلتے ہوئے ہر رو فیشن میں آپ کو ایسے اللہ کے پیارے نظر آئیں گے جو دنیا میں ہیں لیکن اس کے طلب گار نہیں ہیں۔ ان کی مسکراہٹ سدا بہار، آواز نیچی، چلت پھرت نامحسوس، کام درست، احکامات کم، ضرورتیں نامعلوم، پسند ناپسند واجبی، گفتگو ضرورت بھر، اور خلق خدا سے رابطہ شفقت کا ہوتا ہے یہ ایسے میر ہوتے ہیں جن کے پاس کوئی پورٹ فلیو نہیں ہوتا۔ یہ نہ کسی ولایت سے نکلنے کسی میں گھسنے کے خواہشمند ہوتے ہیں۔ بس ان کا وجود فطرت کی طرح معصوم ہوتا ہے کہ فطرت

بھائی کے گھر کے ارد گرد لوہے کی نوکیلے کانٹوں والی باڑھ ہے جس پر سے کوونا بے حد مشکل نظر آتا ہے
شباب بھائی ایک قالین نوکیل باز پر بھینکتے ہیں اور کہتے ہیں اشیر خاں کو آگے کر دوہ ایتھلیٹ آدمی ہے تم
سب کو پھلانگنے میں مدد دے گا.....

اشیر خاں ہمارے گھر میں کسی دوسرے شباب عاقب کا آدمی ہے..... یوگی اشفاق کے ہاتھ میں
جو ترشول ہے وہ نیوٹنگ فورک کی طرح سروں سے پر ہے۔ ترشول کی سب سے نیچی، جاندار اور سرہری
نوک اشیر خاں ہے۔ وہ سارے گھر میں گولے کی طرح پھرتا ہے کبھی کھانے کے کمرے میں۔ کبھی لمبے
برآمدے میں۔ کبھی چھت پر کبھی لان میں..... اس کے خوف نویس جماعت میں مانع سے گیس
بنے اور خوابوں کی شکل میں اشیر کے ہم رکاب ہو گئے۔ اب اس نے اوپر کوٹھے پر ان خوابوں کی پناہ میں
چلنا شروع کر دیا..... وہ کرکٹ کھیلنا چاہتا تھا..... ہمارے محتاط اندازے یہ تھے کہ کرکٹ کے سارے
زندگی بسر نہیں ہو سکتی۔ وہ پائلٹ بننے کے خواب دیکھتا تھا۔ ہماری رائے میں پہلے ہی پاکستان میں پائلٹ
کے پروفیشن میں Saturation آگئی تھی۔ اس نے ایم بی اے کے لئے آئی ٹوٹی کا فارم منگوایا.....
میں نے اپنے خوف اس پر مسلط کر دیئے اور باہر جانے سے روک دیا..... اشیر کے بھائی اپنے اپنے
خوف سے رہائی نہ چاہتے تھے۔ ان دونوں نے میری طرح اس اندھے بل ڈاگ کے ساتھ رہنا سیکھ لیا
تھا۔ لیکن اشیر خاں ہمارے گھر میں سب سے مختلف ہے..... وہ خوف سے رہائی چاہتا ہے اور ایک ہی
جست میں کسی ایسے مقام پر پہنچنا چاہتا ہے جہاں دلیری، سچائی اور محنت کسی معجزے سے حاصل ہو جاتی
ہے۔ اشیر خاں کے خوف اسے ambivalence کے دروازے پر لے آئے جس کا ایک پٹ
نفرت اور دوسرا محبت سے بند ہوتا ہے۔ میرے دونوں بڑے بیٹے خوف کی چادر تان کر سو سکتے ہیں، کھاپی
کر سو سکتی زندگی بسر کر سکتے ہیں۔ بقول تلقین شاہ۔

پالا لگے رات نوں..... مینوں دکھاں داکبل دے

میں اوکھا ون گزاریا..... مینوں سوکھا ہوون دے

لیکن اشیر خاں مختلف ہے جیسے وہ اس عہد میں رہ رہا ہو جب ابھی اسلام کا پیغام نہ پھیلا تھا۔ وہ اندر
ہی اندر ایک بڑے پیام کی سرگوشی کسی سے کرنا چاہتا ہو لیکن خوف نے اس کے لب ہی رکھے ہوں۔ وہ
گھر سے گھر تک..... ایک شخص سے دوسرے تک..... گلیوں میں بازاروں میں..... گھومتا ہو..... لوگ
اسے کھجور کھلا کر پانی پلانا چاہیں..... وہ بھی پینا چاہے لیکن پی نہ سکے..... اندر کے کرب پر منہ بند
خوف کا کھٹنا کھولنا چاہے لیکن صرف پھرتا ہے۔

یہ صبر کی کیفیت اس میں بہت بچپن میں پیدا ہو گئی تھی۔

ابھی وہ تیسری جماعت میں پڑھتا تھا جب اچانک اسے تیز بخار آنے لگے۔ کئی ڈاکٹروں کو دکھایا۔



بہت علاج کئے بخار دب جاتا۔ کچھ دن ختم رہتا، پھر سر نکال لیتا۔ اس بخار کی عجیب کیفیت تھی چڑھتے ہی کبھی ۱۰۴ ڈگری ہو جاتا کبھی ۱۰۵ ڈگری سے بھی تجاوز کرنے لگتا لیکن اشیر خاں بخار میں بھی میری تسلی کا باعث رہتا وہ اپنی معصوم زبان میں کہتا.....

”امی ٹھیک ہو جائے گا۔ اتر جائے گا بخار.....“

بخارا اتنے سال آتا رہا کہ اس کے دانتوں کا رنگ پلے اینٹ جیسا ہو گیا۔ آنکھیں زرد اور چہرہ باسی رہنے لگا پھر ڈاکٹروں نے فیصلہ کیا کہ اسے Liver abscess ہے..... جو نئی آپریشن ہو گا بخار کی کیفیت جاتی رہے گی جس وقت اسے آپریشن تھیر سے باہر لائے اسی شام اسے دوبارہ بخار آنے لگا۔ پھر ایک معجزہ ہوا.....

صبح کے وقت ڈاکٹر احمد خاں نے داستان سرائے کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ میں نے دروازہ کھولا تو وہ بولے..... ”کیا گھر پر کوئی بیمار ہے؟ رات میں نے خواب دیکھا جیسے تمہارے گھر میں خیریت نہیں۔“ ڈاکٹر احمد خاں ملتان میں ڈائریکٹر ایگریکلچر ہوا کرتے تھے اور شغل کے طور پر ہومیو پتھی کا علاج کرتے تھے۔ میں نے اپنے بیٹے کا حال سنایا۔ انہوں نے مجھے کہا.....

”چونکہ خواب میں بشارت ہوئی ہے اس لئے میرے علاج سے انشاء اللہ بچہ ٹھیک ہو جائے گا تم باقاعدگی سے علاج کرنا.....“

میں باقاعدگی سے علاج کرنے لگی لیکن مجھے ہومیو پتھی پر اعتماد نہیں تھا۔

میرا خیال تھا جو اتنے جتن سے ٹھیک نہیں ہوا اس کی زندگی کا کیا بھروسہ۔ اس لئے نہ میں اسے کبھی پڑھنے دیتی نہ کسی چیز سے منع کرتی۔ اشیر گڈیاں اڑاتا، بندوق لے کر چھٹکیاں مارتا، کرکٹ کھیلتا۔ اسے وقت ضائع کرنے پر کسی نے کبھی نہ ٹوکا..... بیماری کے یہ سات سال ہر وقت غزل کا موسم رہا..... آہستہ آہستہ ڈاکٹر احمد خاں کے علاج سے اشیر رو بہ صحت ہونے لگا..... لیکن اس سال وقت کا اس کے دل پر ایک عجیب سا اثر رہا۔ اس نے اپنی ڈائری میں سب کی نظروں سے چھپا کر ایک مرتبہ لکھا.....

”انسان کی سوچ ایک عجیب چیز ہے۔ ایک خیال کی کمی بیشی سے انسان خود کشتی سے

اتر جاتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ جو کچھ آٹھ سالوں میں میرے ساتھ ہوا وہ آپ کے ساتھ بھی ہو رہا ہو..... سوچ..... سوچ اور پھر سوچ۔ بچپن میں کسی وجہ سے نہ تو آپ سے کوئی امید رکھی جاتی ہو اور نہ ہی آپ میں کوئی توفیق رکھی جائے کہ آپ نے کیا کرنا ہے؟ ماں باپ اور دوسروں کی محفل میں خوشی اور راحت تو بہت محسوس ہوتی ہے لیکن جب وقت گزر جاتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ سوچ اب عادت بن گئی ہے۔ ایسی سوچ جس کو آپ کا ضمیر پسند نہیں کرتا جو آپ کو عمل

سے دور لے جاتی ہے۔ ایسے میں دعا کے علاوہ اور کوئی چیز نہیں جو آپ کو اس سوچ کی مصیبت سے بچائے سب کچھ روٹین میں بدل دے اس طرح خیال کا پنڈولم کبھی اس میدان میں کبھی اس میدان میں رہتا ہے حالانکہ میدان تو صرف ایک ہے.....

معجزے کا میدان..... اور صاحب معجزہ کی دعا..... اسی دعا کے سمارے انسان دوبارہ کشتی پر سوار ہو سکتا ہے.....“

اشیر خاں ایک معجزے کا منتظر تھا بالکل ویسا معجزہ جیسا اس کی صحت کے ضمن میں ہوا تھا۔

اسے ان ہونٹوں کی آس تھی۔ وہ اپنی ذہانت اور جذبے دونوں سے خوفزدہ تھا۔ اس کی خواہش تھی کہ کہیں اندر ہی اندر ان دونوں میں بغیر و نگفاد ہوئے سمجھوتہ ہو جائے..... وہ شباب بھائی سے فقط اس معجزے کی آس رکھتا تھا کہ وہ اسے ہر خوف سے نجات دلا دیں۔ سچوں سے آزاد کریں۔ اور عام سی کشتی پر معمولی سے مسافر کی طرح چڑھا دیں۔

اس معجزے کے انتظار میں اس نے کئی برس کتنے ہی میل اپنے پیروں پر پیدل گزاریے تھے اور منہ بند رکھا تھا۔ آنکھوں کو چھلچھل چلنے سے روکا تھا۔ وہ معجزے کا انتظار کرتا تھا۔ جیسے اسلحہ ختم ہو جانے پر بہادر جرنیل ملک کا انتظار کرتا ہے۔ اس نے اپنی بندوق کسی کو مستعار دے دی تھی۔ سائیکل گیراج میں لاک پڑا رہتا تھا۔ کرکٹ وہ کھیلتا آنکھیں بال پر لیکن کان کسی اور آواز پر لگے رہتے۔ وہ خود نہیں جانتا تھا کہ آواز کہاں سے آئے گی؟

اسی لئے شباب بھائی نے آواز دیئے بغیر اسے اپنے قریب کر لیا۔ دیر تک ارض و سماء منتظر رہیں تو ٹھنڈی ہوا ایک دن ضرور چلتی ہے انگور کے خوشے آپنی آپ میٹھے رس سے بھلجھلاتے ہیں۔ اشیر معجزے کا آدمی ہے اور معجزہ ہو گیا..... اشیر خاں محنت کو ماننے لگا۔ روٹین پر ایمان لانے لگا۔ اسے معلوم ہو گیا کہ معجزے کی اصلی روح یہی ہے کہ انسان کسی معجزے کا انتظار نہ کرے۔

جب بھی شباب بھائی آتے اشیر کی حالت کچھ اور ہوتی۔ وہ شباب بھائی کے تعاقب میں رہتا۔ جیسے کوئی نوجوان کنوئیں پر آنے والی لڑکی کا انتظار کئی درختوں کے پیچھے باری باری چھپ کر کرتا ہے۔ وہ

شباب بھائی کے قیام کے دوران گھر سے باہر شازبی جاتا۔ اس کے کان ان کی آواز پر لگے رہتے..... سب کی نظریں بچا کر وہ شباب بھائی کے کمرے میں جایا کرتا اور ان کے پاس بیٹھتا..... شباب بھائی اسے سمجھاتے..... ”عام آدمی اور خاص آدمی کے سفر میں فرق نہیں ہوتا۔ دونوں جب بچہ ہوتے ہیں تو ہنستے کھیتے ہیں۔ جوان ہونے پر عشق کرتے ہیں۔ محنت سے گھر کی دیکھ رکھ کرتے ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ عام آدمی کو معلوم نہیں ہوتا کہ ایک رستہ کس وقت بند کھلی میں ختم ہوتا ہے وہ اگر عشق کرتا ہے تو

بس وہ ہماری الجھنوں کا بوجھ کسی مافوق الفطرت طریقے سے اٹھالیتے تھے..... مسئلہ رہتا تھا..... لیکن تکلیف باقی نہیں رہتی تھی..... حل نہیں ملتا تھا لیکن یوں لگتا کہ اب مسئلے کے حل کی کوئی ضرورت بھی نہیں ہے۔

اثیر خاں کی وجہ سے شباب بھائی کے کچھ اور پرت کھلنے لگے اب وہ کھانے کے بعد سونے سے پہلے ہمارے کمرے میں آ جاتے، صوفے پر بیٹھتے اور اپنی اس ٹانگ کو آگے پھیلا کر بیٹھ جاتے جس میں حیات ختم ہو چکی تھیں۔ اس ٹانگ کے نیچے اثیر خاں گدی رکھ دیتا۔ ان محفلوں میں عموماً کوئی بڑا موجود نہ ہوتا۔

انیق خاں اور غزل، انیس خاں اور ٹولہ، اثیر خاں اور میں ان کی پھیلی ٹانگ کے ارد گرد انگریزی کے ”یو“ کی شکل میں بیٹھ جاتے۔ فضا میں اشتیاق، حسرت، تحیر پھیل جاتا۔ بظاہر یوں لگتا جیسے اثیر خاں غیر متوجہ ہے، روگردہ سے الگ تھک بیٹھتا۔ نہ سنتا نہ سوال کرتا..... بس شباب بھائی کو اپنے اندر جذب کرنے کی کوشش کرتا۔ ایک روز جب ٹولہ چائے انڈیل رہی تھی اور غزل سب میں مٹھائی بانٹنے میں مشغول تھی انیس نے سوال کیا..... ”شباب چچا غصے کو دور کرنے کی کوئی ترکیب بتائیں؟“ چچا ہوا غصہ اعلانیہ آنے والا..... نہ ٹلنے والا غصہ۔

شباب بھائی مسکرائے پھر چائے کی پیالی وصول کی اور بڑی دردمند آواز میں بولے ”غصہ دراصل آٹا ہی نہیں چاہئے۔ اگر آپ واقعات، حالات، چھوٹی چھوٹی باتوں کو اپنے میں سے گزر جانے دیں جیسے پانی چھلنی میں سے گزرتا ہے تو بہت جلد ایسی عادت بن جائے گی کہ غصہ کم آنے لگے گا.....“

اثیر خاں نے بغیر نے یہ چھلنی قبول کی۔

”لیکن شباب چچا ہمارے اندر تو جب کسی بات پر غصہ چڑھ جائے تو کسی طرح گزرتا ہی نہیں۔“ غزل بولی۔

”مثال کے طور پر کسی نے آپ کو کچھ کہا تو اب اس بات پر ری ایکشن فورم نہیں کرنا۔ بس بات آئے اور گزر جائے۔ مشکل ساری یہی ہے کہ آپ رد عمل کے طور پر یا تو کچھ کرنا چاہیں گے یا جواب دینا چاہیں گے۔“

”ہاں مشکل ہے لیکن زیادہ نہیں تھوڑی سی پریکٹس سے غصے پر قابو پایا جاسکتا ہے شروع میں آپ صرف بڑا مشکل ہے..... شباب چچا“ انیق خاں بولے

”ہاں مشکل ہے لیکن زیادہ نہیں تھوڑی سی پریکٹس سے غصے پر قابو پایا جاسکتا ہے شروع میں آپ صرف بڑا مشکل ہے..... شباب چچا“ انیق خاں بولے

”ہاں مشکل ہے لیکن زیادہ نہیں تھوڑی سی پریکٹس سے غصے پر قابو پایا جاسکتا ہے شروع میں آپ صرف بڑا مشکل ہے..... شباب چچا“ انیق خاں بولے

”پر وہ کیسے شباب چچا..... ناممکن

ساری عمر، ادھیڑ ہو کر کبھی کبھی بڑھاپے میں بھی اسیر زلف ہی رہتا ہے وہ اگر کھانے پینے کا، نمیری بجائے کا، خوش لباسی کا، خطوط نویسی کا..... غرضیکہ کوئی بھی شوق پالتا ہے تو آخری وقت تک ان ہی مشغلوں کے سارے جیتا چلا جاتا ہے۔ اس میں نہ بڑھاپے کی Acceptance پیدا ہوتی ہے نہ ہی ارتقاء کا حوصلہ..... میں ایک زمانے میں دلربا بجاتا تھا، لیکن پھر اس شوق کی منتہا پر پہنچ کر مجھے لگا کہ میری روح کی پسنائی کے لئے یہ کم ہے..... رفتہ رفتہ..... آہستہ آہستہ شوق..... کبھی پورے ہو کر، کبھی ادھورے رہ کر، کبھی Consume ہو کر ختم ہو جاتے ہیں۔ لیکن جو آدمی اللہ کے راستے کا شوق پال لیتا ہے وہ ہمیشہ بڑھتا رہتا ہے وہ اس شوق میں کچھ نہیں پاسکتا اس لئے چلتا رہتا ہے کسی معجزے کرامت کی راہ..... نہیں دیکھتا۔ اور حسن خاتمہ پر منتہی ہو جاتا ہے..... جو آدمی بڑھاپے میں اپنی جسمانی قوت کا مظاہرہ کرتا ہے، بنی پڑتا ہے، جو لنگ کرتا ہے اور اپنے آپ کو جوان ثابت کرنے کے لئے بال رنگتا ہے، صحت مندی کے ذریعے اپنی فلاح چاہتا ہے..... جو بیماری، سفید بال، کمزور ناگوں، بے مصرف زندگی کی افادیت کو نہیں سمجھتا وہ حسن خاتمہ کا طالب نہیں ہو سکتا اور نہ ہی اس تک پہنچ سکتا ہے..... جوانی لوٹ آنے کا معجزہ ہو نہیں سکتا اور بڑھا ریزہ ریزہ ہو جاتا ہے اس لئے صرف Pedestrian رہو..... خود بخود خوف کے زرخے سے نکل جاؤ گے..... چلتے رہنا بذات خود

ایک معجزے سے کم نہیں.....

اثیر خاں کی کوشش ہوتی جہاں بھی شباب بھائی جائیں وہی ان کا ڈرائیور ہو۔ وہ دھیان رکھتا کہ سونے سے پہلے تھرموس میں پانی ڈال کر ان کی ڈرائیونگ ٹیبل پر رکھا جائے۔ شباب بھائی پانی مانگتے تو وہ برف کوٹ کر ایسا ہی پانی لانا کہ وہ خوش ہو جاتے۔

”آج اشفاق علی خاں کے گھر چلیں گے؟“

”جی اچھا.....“

وہ وقت سے پہلے تیار ہو کر ان کے دروازے کے باہر بیٹھ جاتا۔

”آج مسعود کے گھر جانا ہے..... مسعود کھدر پوش.....“

”جی اچھا.....“

اس نے ہم سے کبھی دل کی بات نہ کی لیکن جب بھی وہ ان لمبی ڈرائیور پر جاتے اپنے خوف اور ان سے جنم لینے والے خوابوں کا ذکر شہا..... بھائی سے ضرور کرتا ہو گا۔ مجھے یقین ہے کہ شباب بھائی سب کچھ سننے کے بعد کہتے ہوں گے.....

Let it pass

کیونکہ شباب بھائی نہ تو کسی کے حالات میں دلچسپی رکھتے تھے..... نہ مسائل کا سلجھاؤ کرنا چاہتے تھے.....

ناممکن.....

”پہلے پہل صرف ہاتھوں کو قابو میں کریں..... رفتہ رفتہ زبان کو کنٹرول کریں..... اس کے بعد اندر کے خیالات کی باری آئے گی..... اندر سوچ بھی غصے والی نہ رکھیں..... جب آپ واقعات، گفتگو، حادثات کو پاس کرنے کی اجازت دیں گے تو زیادہ دیر نہیں گزرے گی اور آپ کی اتنی پریکٹس ہو جائے گی کہ اول تو عام باتوں پر غصہ نہیں آئے گا..... پھر آہستہ آہستہ..... آہستہ آہستہ خاص باتوں پر بھی اتنا مجروح نہیں ہوگی..... اس سے آگے ایک وقت ایسا آئے گا جب غصہ ان کی وجہ سے آئے گا ہی نہیں.....

”اور جب تک اتنی پریکٹس نہ ہو اور غصہ آجائے تب..... تب کیا کریں شاب چچا.....“ انہیں خاں بولے۔

شاب بھائی نے اشیر خاں کی جانب ذرا سادہ دیکھا اور بولے..... ”اگر کبھی زبان اور ہاتھ چل جائیں تو پھر آسان طریقہ ہے..... دل سے پشیمان ہوں اور دور کھٹ نفل نماز کفارہ ادا کریں۔ نفس پر یہ سزا بہت گراں گزرتی ہے..... جب دن میں کئی بار غصے کے عمل سے نالاں ہو کر نفل پڑھنے پڑے تو بہت جلد غصہ کم آنے لگے گا.....“

”پھر میں تو سارا دن جائے نماز پر ہی رہوں گی.....“ ثویلہ نے کہا۔

”میں بھی.....“ غزل بولی۔

”اور میں بھی.....“ انیق خاں نے کہا۔

”اور میں تو پہلے.....“ انیس بولا۔

سب ہنسنے لگے..... لیکن اشیر خاں چپ رہے۔ وہ بغیر سنے آنک رہا تھا کہ اب اسے کیا کرنا ہو گا؟ غلٹ لا پرواہی، غصے کی طنائیں کیسے کھینچنی ہوں گی اور شاب بھائی کی بات کو زندگی میں کیسے سمونا ہو گا..... پھر ایک روز یوں ہوا

شاب بھائی ہمارے کمرے سے جانے والے تھے۔ غزل نے ذرا سادہ روزہ کھول کر پوچھا.....

”شاب چچا آپ دودھ پئیں گے؟“

شاب بھائی کچھ سوچ میں پڑ گئے۔

”اشفاق شہد ہے تیرے پاس.....“ شاب بھائی نے پوچھا

خان صاحب ہنگ پر اپنی مخصوص نشست میں ایک بازو سرتے، ایک زانو کھڑی ٹانگ پر، دوسری ٹانگ دھرے پاؤں کے ٹکڑے پر ہاتھ جمائے ہوئے تھے۔

”ہاں یار ہے تو سہی پر وہ چھوٹی کھسی کا شہد ہے اور آنکھ میں ڈالنے کے لئے چچا وطنی سے منگوایا ہے۔“

اشیراٹھ کھڑا ہوا اور شہد کی بوتل تلاش کرنے کے لئے باورچی خانے میں چلا گیا۔

”غزل ایک چچا بادام روغن اور ایک چچا شہد کی ملا کر لانا.....“

غزل اتنی خوشی سے گئی جیسے غزال صحرائیں چوکڑیاں بھرتا جاتا ہے.....

اب خان اور شاب بھائی میں شہد پر گفتگو ہونے لگی۔

”یار بڑا مزگا شہد ہے اور صرف آنکھوں میں ڈالنا چاہئے.....“

دونوں دوست اب خوش دلی سے کتنی ہی دیر شہد، اس کی وصولی، استعمال، دریافت، افادیت پر باتیں کرتے رہے۔ ہمیں پتہ نہ چلا کہ کس وقت غزل دودھ میں شہد، اور بادام روغن ملا کر لے آئی۔ جس وقت وہ دودھ پل رہے تھے دروازے پر دستک ہوئی۔ انیس کے دوستوں کی ایک کھیپ اندر آئی اور شاب بھائی کے ارد گرد گھیرے میں بیٹھ گئی۔ پتہ نہیں شاب بھائی میں وہ کیا کرشمہ، حسن، کھچاؤ تھا کہ نوجوان ان کے پاس بیٹھنا پسند کرتے تھے۔ عام طور پر یہ نوجوان ”سلام انکل سلام آئی“ کہہ کر پلا چھڑایا کرتے ہیں لیکن شاب بھائی کو دیکھ کر آزاد پرندے بسرام کرنے لگتے۔ کوئی کرسی پر آگے ہو کر کوئی کھڑے زانو کے گرد بازو پلیٹ کر کوئی سر جھکائے چپ چاپ ان کا چہرہ دیکھتے ہوئے بیٹھ جاتا، سب نوجوان ان کے حکم، ارشاد، گفتگو، کی راہ دیکھتے اور لطف کی بات یہ کہ ان سب کو بھی علم نہ ہوتا کہ وہ کسی ندی کے بننے، پھول کے کھلنے، ہوا کے چلنے کے منتظر ہیں۔

اس روز ارشاد ہوا.....

”ہاں تو قاسم تم تو پوچھتے ہو کہ اگر میں اس ملک کا بادشاہ بن جاؤں تو کیا کروں؟.....“

”جی چچا.....“ قاسم نے سینکوں کے پیچھے سے حیران آنکھوں سے پوچھا۔

شاب بھائی سے سیاست پر بہت کم باتیں ہوا کرتی تھیں۔ وہ کبھی کبھی اخبار کی سرخیاں پڑھ کر مسکرایا کرتے اور چھوٹے چھوٹے فقروں میں ان سرخیوں کے بے معنی پن پر تبصرہ کرتے رہتے لیکن سیاست پر نہ کبھی انہوں نے دھواں دھار تقریر کی نہ لمبے چوڑے مباحثوں میں شمولیت کی۔

”پھر چچا جو آپ پاکستان کا بادشاہ بن جائیں تو کیا کریں.....“

اشیر خاں نے خفگی سے قاسم ادریس کی طرف دیکھا۔

”میں کیا کروں؟ کچھ بھی نہیں.....“ شاب بھائی مسکرا کر بولے۔

”کوئی رفارم تو ہوں گی..... زرعی یا اصلاحی.....“ شاہد افضل بولا۔

”نہیں چچا؟ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟“

”بس میں آرام سے پادشاہت کروں..... زیادہ سے زیادہ رشوت کو Legalize کروں۔ کچھ لوگوں کا کام اگر حکومت کے کارندے جلدی کر دیں تو کچھ حق خدمت لیگل ہو..... دسویں تک امتحان

موقوف..... صرف حاضری سو فی صد ہو..... بعد میں دسویں کی ڈگری مل جائے۔“
شاہد افضل جو شیلا کو جو ان ہے۔ وہ کچھ کر بولا..... ”لیکن چچا یہ کیسے پتہ چلے گا کہ دسویں کا کورس اسے آ گیا ہے.....“
شباب بھائی بڑی خوش دلی سے بولے..... ”جو دس سال سکول آتا رہے گا تو کچھ نہ کچھ تو سیکھ ہی جائے گا ویسے بھی آخر دسویں پاس کو آتا ہی کیا ہے.....“

سارے دسویں پاس لڑکے لڑکیاں ایسے خوش ہو گئے جیسے انہوں نے فری دسویں پاس کر لی ہو.....
”شباب چچا پر پلینز پائیس کیا آپ کوئی تبدیلی نہیں لائیں گے..... کوئی بھی؟.....“
قاسم کچھ کر گزرنے والا ان کو ان تھاس کی خواہش تھی کہ پاکستان میں کچھ ریڈیکل ہو اور وہ اس بنیادی تبدیلی میں اہم حصہ لے۔

”ہر سوسائٹی ہر معاشرہ ہر وقت تبدیل ہو رہا ہے کچھ تبدیلیاں آپ دیکھ سکتے ہیں۔ کچھ تہہ در تہہ ہو رہی ہیں۔ آمدورفت کے وسائل سے، میڈیا کے وسیلے سے دنیا سکر رہی ہے اب جو کچھ مشرق بعید میں ہوتا ہے دور دور تک مغرب میں اثر رکھتا ہے..... مختلف نسلوں اور رنگوں کے لوگ عجیب نہیں لگتے۔ کچھوں کا بعد کم ہو رہا ہے تبدیلی ظاہری اور باطنی ہوتی رہتی ہے لیکن ایک بہت باریک سی تبدیلی ہے جو اللہ کی مشیت سے آتی رہتی ہے۔ جو شخص یہ سمجھ لیتا ہے کہ جو کچھ ہو رہا ہے جو کچھ ہو گا سی کے حکم سے ہو رہا ہے وہ ان فروغی تبدیلیوں سے پریشان نہیں ہو گا..... جیسے کسی معزز شہری کی آمد سے پہلے پنڈال میں کرسیاں لگتی ہیں۔ شامیانے کی طنائیں کسی جاتی ہیں۔ ڈائیس بنتا ہے..... ایک خالی خولی میدان میں جب بہت ساری تبدیلیاں خاطر خواہ طور پر آ جاتی ہیں تو پھر صاحب صدر کی سواری آتی ہے.....“

”یعنی کچھ نہیں بدلتا؟..... بس ایسے ہی رہنے دیں سب کچھ؟.....“
شباب بھائی دو دھ پیتے رہے پھر بڑی دیر بعد بولے..... ”اس باریک تبدیلی کو پہچاننے کی کوشش کرنی ہے“ اس کا دھا کہ پکڑنا ہے، پھر اندر باہر جو بدلتا ہے بدل جائے پر دھاگے کو نہیں چھوڑنا..... آپ سب جانتے ہیں۔ جو تبدیلی ہم خود لاتے ہیں اس میں کچھ اچھا ہوتا ہے کچھ برا..... لیکن جو تبدیلی اللہ لاتا ہے وہ ساری کی ساری اچھی ہوتی اس میں اچھا برا املا جلائیں ہوتا.....“
سارے لڑکے لڑکیاں خوش خوش اٹھ گئے۔

کچھ نے یہ جانا کہ سائیز برنر پر شباب چچا ناراض نہیں کیونکہ یہ تبدیلی فروغی ہے ایک دو نے یہ سمجھا کہ میڈیا اور ٹرانسپورٹ دراصل فاصلوں کو کم کرنے کی انشٹی ٹیویشن ہیں۔ چند نے سوچا کہ شباب بھائی تو بڑے پروگریسو ہیں۔ رشوت کو بھی لیگا لائیز کر رہے ہیں۔
ایک لڑکی نے سر سے دوپٹہ اتار دیا اور سمجھ گئی کہ جو شخص امتحان ہی نہیں چاہتا اس سے کیا ڈرنا۔ جو

انگشتا نہ بھر کا وہ انگلی کے پوٹے بھر ساتھ لے گیا۔ جو دیگ ساتھ لایا تھا وہ بے شمار سمیٹ لے گیا۔
ان ہی سب میں کہیں اشیر خاں بھی تھا جو بے قراری کے عالم میں کبھی آتا کبھی جاتا..... نہ وہ سنتا تھا نہ سمجھتا تھا پر کہیں سے شباب بھائی کے وجود سے اسے کرٹ مل رہی تھی اور وہ جوڑے کی طرح اس محبت بھرے سینک کو محسوس کر رہا تھا۔
گر میاں تھیں۔

موسم اپنی شدت سے جاسن اور آم پکانے میں مصروف تھا۔ صبح صبح اعجاز بنالوی مکھن سے بھرا کٹور اڑے گئے، دن چڑھے پر جیلہ ہاشمی نے آموں کی پٹی بھیج دی تو دوسرے کھانے پر ہشیم فاطمہ نے تھیلہ بھر جاسن بھجوائے۔ شام کو دھرم پورے کے ڈیرے پاک سے کھانا آ گیا۔ اقبال بھائی آئے تو ان کی کار میں سیٹ بھر ٹیوب روز کے گلدستے تھے..... غفار اپنی لیتھ مشین پر شین لیس شیل کی گراریاں بنالایا..... عکسی مفتی چند گھنٹے ٹھہرا اور خان کے لئے سوس کے جوڑے دے گیا..... بھائی ابو الحسن اور سعیدہ جی خوبصورت اجرک اور چادریں چھوڑ گئے۔ پروین عاطف خوشبو کی بوتلیں دھر کر غائب ہو گئی..... عشرت نے ملتان سے انور انول کی بیٹیاں بھیج دیں۔ ڈاکٹر مسعود اختر داتا دربار کے ہار لے کر حاضر ہو گئے۔

یہ ہمیشہ ہوتا تھا وہر شباب بھائی کاسنی کمرے میں ٹھہرتے ادھر نعتیں گھر کا غلاف کرنے لگتیں۔ جس طرح برسات کی شاموں میں پتنگ روشن پرتے ہیں۔ ایسے ہی ان جانے لوگ، لفافے، طشت، شاپر، نوکریاں، چھابے لے کر آتے رہتے۔ وہ سب بھی نہیں جانتے تھے کہ یہ خوشی کیوں ہے؟ اور ہم جو ہاتھ بڑھا رہا کر ”فتوحات“ قبول کرتے، ہمیں بھی علم نہ تھا کہ کاسنی کمرے والے کی برکت سے یہ ہار پان، پھول اور پھل فضا کو مکانات کے لئے آتے ہیں۔

اس شام ہم شباب بھائی کی فتوحات کے آم کھا رہے تھے لیکن فضا بو جھل تھی خان صاحب آم کاٹ کر دے رہے تھے وہ آم کے دونوں جانب کے قتلے کاٹ کر شباب بھائی کو دیتے اور خود گٹھلی کھانے لگتے۔ کچھ دیر بعد شباب بھائی بولے..... ”یار اشفاق یہ تو ہمیشہ کیوں غریب سا گٹھلی کھانے لگتا ہے، آج قتلے تو کھائے گا اور گٹھلی مجھے دے گا۔“

شباب بھائی غریب سی گٹھلی کھاتے رہے اور چھوٹی چھوٹی مڑے دار باتوں سے فضا کو اجالتے رہے لیکن اس روز فضا میں نمی بچانویں فی صد تھی ان کی باتوں سے بھی چروں پر خوشی نہ آئی۔ دراصل ہم تینوں صدیقہ جاوید سے مل کر آرہے تھے چودھری برکت علی کی بیٹی ”ادب لطیف کی ایڈیٹر صدیقہ بیگم کے شوہر اور خان صاحب کے بھانجے جاوید طارق نے دوسری شادی کر لی تھی اور صدیقہ سے ملنے کے بعد ہم تینوں کے دلوں پر عجیب قسم کا بوجھ تھا۔ فضا میں صدیقہ کے آنسوؤں کی سیلن تھی بڑی دیر کے بعد ارشاد ہوا.....
”اشفاق..... ہم لوگ غم اور Bitterness میں فرق نہیں کرتے۔ غم بڑی مفید چیز ہے یہ اللہ کی

”زیادہ Involve ہوئے بغیر دنیا کے کام کرو۔ سارے کام۔۔۔۔۔ لوگوں سے زیادہ گھال میل کے بغیر ان سے ملے رہو۔۔۔۔۔ ان کی غی خوشی میں شامل رہو۔“

”تیرا خیال ہے قدرت یہ آسان کام ہے۔۔۔۔۔؟“

”آسان تو نہیں لیکن کچھ ایسا مشکل بھی نہیں۔ جب کچھ حاصل کرنا چاہو گے تو قدرتی طور پر مبتلا بھی زیادہ ہو گے۔ یہ جو توانا کثیر المقاصد ہے اشفاق، یہ رنگارنگی کم ہو جائے گی۔۔۔۔۔ جب دنیا میں رنج بس کر اس کی گہما گہمی میں کھو کر زندگی بسر نہ کرو تو آہستہ آہستہ اندر گرما گرمی پیدا ہونے لگتی ہے۔ بس یہ ہی نسخہ ہے دنیا کو دین بنانے کا۔۔۔۔۔ سب کام کرو۔۔۔۔۔ سب میں ملے جلے ہو پرا اندر کی ٹھنکی جاری رہے۔۔۔۔۔ اندر کے سفر میں پیدل چلنا کم نہ ہو دھیان ادھر ہی رہے۔“

گازی نمر کے ساتھ ساتھ جاری تھی۔ شاب بھائی خاموش ہو گئے غالباً انہوں نے اپنی ٹھنکی جاری کر لی تھی ہم دونوں چپ ہو گئے لیکن میرے اندر کا شور بڑھ گیا جب تک میں کسی سے بولی نہ رہوں یادہ مجھ سے باتیں نہ کرتا رہے مجھے لگتا ہے کہ یادہ ناراض ہے یا جلد ہی میری زور و زنجی اسے ناراض کر دے گی۔ خاموش ہوتے ہی تنہائی کا بیگیٹر دے پاؤں میری طرف بڑھنے لگتا ہے۔ میں ماحول، لوگوں کے چرے موسم کا منہ ٹکے لگتی ہوں۔ اس رات بھی میں نے شاب بھائی کا چہرہ چاند رات میں دیکھا وہ چپ تھے لیکن اداس نہیں تھے انہیں یہ خوف بھی نہیں تھا کہ انہیں چپ پا کر ہم ناراض ہو جائیں گے۔ انہیں ہم سے کچھ حاصل نہیں کرنا تھا۔ وہ ہم سے کچھ چاہتے نہیں تھے۔ نہ ہماری رائے، نہ ہماری خوشنودی، نہ ہماری دوستی نہ ہماری دشمنی، بس ایسے آزاد شخص کے لئے ہر ماحول میں خوش رہنا اور کبھی بور نہ ہونا کتنا آسان تھا۔

جب ہم گھر پہنچے تو اشیر خاں گیٹ پر کھڑا تھا۔ کار اندر چلی گئی تو وہ بھی چپ چاپ اندر جانے لگا۔ شاب بھائی نے آہستہ سے پوچھا۔ ”کیوں بھی سوئے نہیں۔۔۔۔۔“

”بس جی ایسے ہی۔۔۔۔۔ وی سی آر دیکھ رہا تھا۔“

اشیر خاں دروازے کے آگے رکاوٹ لگاتی تھی بولا۔۔۔۔۔ ”شاب چچا پانی پیئیں گے؟“

”ہاں بھی اگر ٹھنڈا ہو تو کیا کہنے۔۔۔۔۔“

اشیر خاں نے پیچ پانی تھرموس میں ڈالا اور ایسی بے پرواہی سے تھرموس ڈریسنگ ٹیبل پر رکھی گویا ساری شام اس نے کسی کا انتظار ہی نہ کیا تھا۔

ویسے انتظار تو معدا رنی سرداراں بھی شاب بھائی کا بہت کیا کرتی تھی۔

دھان پان اجلی تازک چہرے اور بدن والی سردازاں ٹاکی پھیرتے کتے۔

”اب تو بہت دن گزر گئے ہمارا بابا نہیں آیا۔۔۔۔۔“

سرداراں کی آواز دھبی، لباس صاف اور چہرہ کھتری عورتوں کی طرح ملائم ہے وہ بھی غالباً

رضا کو سمجھنے کا ایک طریقہ ہے۔ اپنی شخصیت اور عاقبت سنوارنے کے لئے اہم ہے۔ غم نہ ہو تو زندگی آدھی رہ جائے لیکن غم میں bitter ہو جانا، اپنے آپ سے بھی نا انصافی ہے اور اللہ پر ٹوکل کے بھی منافی ہے۔ صدیقہ کو چاہئے کہ وہ غم کرے، آنسو بہائے، اس سے اللہ کی رحمت جاگتی ہے تلافی کے امکانات بڑھتے ہیں لوگوں کی ہمدردی، محبت حاصل ہوتی ہے۔ غم میں نئے ساتھی ملتے ہیں۔ زخم پر پھاسے رکھنے والوں کا ساتھ ہو جاتا ہے۔ لیکن جب آدمی تلخ ہو جائے تو وہ جھگڑے میں پڑ جاتا ہے اپنا استحقاق سمجھ کر منوانے کی ضد کرتا ہے۔ حاصل حصول تو ہی ہوتا ہے جو اللہ کو منظور ہوتا ہے اس احتجاج میں شخصیت تباہ ہوتی ہے اللہ پر ایمان کمزور ہوتا ہے اور دنیاوی طور پر بھی کئی ایسے نقصان ہو جاتے ہیں جن کی تلافی ممکن نہیں رہتی اگر تمہارا صدیقہ پر کچھ اختیار ہے تو تم اسے یہی سمجھاؤ۔ غم کرے۔۔۔۔۔ آنسو بہائے لیکن جھگڑا نہ کرے۔۔۔۔۔ تلخ نہ ہو، تندی میں نہ آئے، راضی برضا رہے۔

ہمارا صدیقہ پر کوئی اختیار نہ تھا۔۔۔۔۔ اس کے آنسو اتنے بے ساختہ اور چہروں مظلوم تھا کہ اس کے سامنے ہم دونوں کی زبان بند ہو جاتی۔ فروغی باتیں ہوتی رہتیں۔ شاب بھائی کی بات کا اعادہ ممکن نہ ہوتا۔

فیض ڈے والی رات کا ذکر ہے۔

اس روز الحمراء کے ہال نمبر ایک میں لوگ بڑے دھوم دھام سے فیض صاحب کی یاد کو نذرانے دینے کے لئے آئے تھے۔ ہال میں مل دھرنے کی جگہ نہ تھی۔ شاب بھائی صدارت کر رہے تھے۔ تصویریں کھینچ رہی تھیں۔ کبھی کبھی مجھے احساس ہوتا جیسے شاب بھائی موجود نہیں ہیں۔ جب فنکشن کے بعد ہم گھر آ رہے تھے تو کار میں میں نے پوچھا۔۔۔۔۔ ”شاب بھائی کبھی آپ غائب ہو جاتے تھے۔۔۔۔۔ وہ کیوں؟“

شاب بھائی مسکرائے اور بولے۔۔۔۔۔ ”مجھے جب وقت ملتا ہے میں اندر کی ٹھنکی چلا لیتا ہوں۔۔۔۔۔“

”اندر کی ٹھنکی؟“

”خال صاحب نے پوچھا۔

”یار ایئر پورٹ ہو۔۔۔۔۔ پلٹ فارم ہو۔۔۔۔۔ کوئی ایسی جگہ ہو جہاں لمبا چوڑا انتظار ہو تو میں اندر ذکر شروع کر دیتا ہوں۔۔۔۔۔ پھر نہ وقت کا پتہ چلتا ہے نہ میں کبھی بور ہوتا ہوں۔۔۔۔۔“

”قدرت یہ تو کیسے کرتا ہے دنیا کا ہر کام بھی کر لیتا ہے اور اندر کی کمپس بھی درست رکھتا ہے۔

کیسے؟ کیسے کیسے؟؟“

خال نے کار کی وینیل پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا

”اگر تم کسی سے میری ٹھنکی کا ذکر نہ کرو تو میں تمہیں دنیا کو دین بنانے کا نسخہ دے سکتا ہوں۔۔۔۔۔“

ہم دونوں خوشی سے اچھلے اور وعدہ کر لیا۔

جھاڑو پھیرتی، ٹانگی مارتی اپنے بیٹے اللہ وسایا کی ہلکی چلائے رکھتی ہے۔ عورت اور بھگت کا ہمیشہ سے ایک ساحال ہے۔ غالباً اسی لئے برصغیر کے صوفی حضرات نے عورت ہی کی زبان میں اللہ کو یاد کیا ہے۔

عورت بچے کا جاپ نہیں چھوڑتی اور اللہ کا پیارا ادھر کی رسی نہیں چھوڑتا۔ اسی لئے جب کبھی کوئی عورت کسی اللہ کے پیارے کو دیکھ لیتی ہے اس کے سر پر آبی آپ دوپٹہ آجاتا ہے وہ مؤکب ہو جاتی ہے ہاتھ جوڑ کر بات کرتی ہے۔ غیر شعوری طور پر اسے معلوم ہوتا ہے کہ اس آدمی کو میرے وجود کی پروا نہیں۔ یہ خواہشوں کے تمام درتے بند کر چکا ہے۔ عورت ایسے اچھبے کے سامنے کبھی گستاخ نہیں ہوتی۔ اپنی نہیں منواتی۔ نظربچی رکھتی ہے۔

سرداراں بھی نظربچی کر کے ٹانگی مارتے شاب بھائی سے باتیں کرتی جاتی۔

”باباجی میرا اللہ وسایا بڑا کمزور ہو گیا ہے۔ باباجی میرے اللہ وسائے کی نوکری کہیں لگ جائے۔ بابا جی اللہ وسایا پھر بیوی پنڈ چھوڑ آیا ہے کیا کروں؟“

سرداراں مکمل طور پر اللہ وسایا میں گمن بولتی رہتی۔ شاب بھائی پوری توجہ سے سنتے رہتے کبھی مشورہ نہ دیتے کبھی بات نہ بڑھاتے۔ مدد کرنا چاہتے تو مجھے پیسے دے دیتے کبھی اسے احسان مند کرنے کی کوشش نہ کرتے۔ ایک روز جب سرداراں غسل خانہ دھو کر جا رہی تھی تو شاب بھائی بولے۔ ”کیا اچھی عورت ہے ہاتھ سے ٹانگی پھیرتی رہتی ہے اندر سے اللہ وسائے کا ہاتھ پکڑے رکھتی ہے۔ کہیں اسے ذکر کرنا آجائے تو بیڑا پار ہو جائے۔“

پھر مجھے پچاس روپے کا نوٹ دے کر بولے۔ ”جب میں چلا جاؤں تو اسے دے دیجئے گا۔“

میں نے نوٹ لے لیا۔

”آپ دیکھیں گی اس بار میں بھی اسلام آباد جا کر اپنا Conduct اسی طرح درست کروں۔“

میں نے دل میں سوچا۔ بھلا اب یہ کیا درست کریں گے؟

”چھوٹے بڑے کلک ہیں۔ کئی آلائشیں ہیں۔ انمل بے جوڑ باتیں ہیں۔ وقت کم ہے خرابیاں زیادہ ہیں۔ کون جانے حسن خاتمہ ہو بھی پاتا ہے کہ نہیں؟“ جس روز شاب بھائی ہم سے رخصت ہوئے سرداراں فرش پر بیٹھ گئی اور ان کے پٹنگ پر ہاتھ رکھ کر بولی۔ ”ہائے ہائے ساڑے بابے دی کی لوڑی رب نوں؟ ہوو مخلوق گھٹ اے؟ ہن میں کس نال اللہ وسائے دیاں گھاں کراں۔“

بھلا میں سرداراں کو کیا سمجھاتی کہ ایسے ہی لوگوں کی گھاں سننے کو تو اوپر بلایا جاتا ہے ہلکی کی آواز بر ملا سننے کے لئے تو کھلے آسمانوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ کھلے سرداراں ایسے ہی لوگوں کی توجہ و توجہ رہتی

ہے۔ یہاں اور وہاں۔

پھر یوں ہوا۔

اشیر کا دوست علی گھر سے بھاگ کر ہمارے ہاں آگیا۔ وہ پڑھائی سے اوب چکا تھا اور اسے لیول کا امتحان دینا نہ چاہتا تھا۔ اس کی ماں بنی خوف میں گھری سارے شرمیں یوں ہراساں کار دوڑائے پھرتی تھی جیسے شرمیں اہم ہم پھٹنے والا ہو۔ علی انگریزی میں نازک نازک نظمیں لکھتا تھا۔ اس کے دل پر لڑکیوں کے چاند طلوع ہونے لگے تھے۔ وہ ماں کو خوش کرنے کے لئے پڑھائی کرنا چاہتا لیکن خوبصورت کپڑے، نوجوان امیر دوست، ٹیلی فون کرنے والی لڑکیاں۔ انگریزی کے خوبصورت مصرعے اسے گھر بیٹھنے نہ دیتے۔

نئی ہر رشوت دے کر تھک گئی۔ اس نے ان گنت ٹرولیاں علی کے لئے سجائیں اسے ملک ملک پھرایا۔ شرمیں ہونے والے تمام ورانگی شہو کھائے۔ لیکن علی احسان مند ہو کر پڑھائی کے جال میں نہ پھنسا اور ایک دن اشیر خاں کے ساتھ گھر آگیا۔

شاب بھائی بھی ان دنوں کاسنی کرے میں رہتے تھے۔

یہ بڑی طوفانی شام تھی۔ شاب بھائی پنج پر بیٹھے تھے۔ بنی خوفزدہ تھی کہ اگر اس کا اکلوتا بیٹا ناکارہ نکل آیا تو کیا بنے گا؟ اشیر شاب بھائی کا منہ تک رہا تھا جیسے جانتا ہو کہ اب کچھ بگڑ نہیں سکتا۔ علی سب سے دور شورروں کی طرح جوتیوں کے پاس بیٹھا تھا۔ فضا میں چار سو چالیس دولٹ کی شہتی تھی۔ ہر بات پر کسی نہ کسی کو کرنٹ پڑتا۔ شاب بھائی چپ تھے بنی سرخاسر خچرہ لئے شکوے شکایتوں کی تار پر علی سے ہوتی ہوئی اپنے شہر فطری تک جا پہنچی تھی اس کے خوف کچھ اس طرح اسے شاک لگا رہے تھے کہ وہ جو کچھ بھی بولتی نیم چیخ کی شکل اختیار کر لیتا۔ بڑی دیر کے بعد شاب بھائی نے کہا۔ ”اس کے معاملے میں آپ پریشان ہونا چھوڑ دیں یہ خود ہی اپنے لئے درست فیصلہ کر لے گا۔“

بنی شاب بھائی کے کہنے پر بڑی یقینی کے عالم میں علی کو ساتھ لے گئی اسے شاب بھائی کی بات کا شاید یقین تو نہیں تھا لیکن وہ اشیر خاں کے بابا شاب کے سامنے کچھ بولنا نہیں چاہتی تھی۔

دو دن بعد بنی ہمارے گھر آئی تو اس کا چہرہ پروڈ گل سن کی واپسی پر ڈک رہا تھا اس نے گلابی لباس پہنا ہوا تھا۔ اس کے آنے سے کچھ دیر پہلے شاب بھائی نے پوچھا۔ ”وہ جو خاتون اگلی شام آئی تھی اس کا کیا نام ہے۔“

”بنی۔ نسیم فضل۔“ خان صاحب نے جواب دیا۔

”کل رات میں نے دیکھا اس نے گلابی لباس پہنا ہوا ہے اور وہ ایک ایسی محفل میں ہے جس کا میں عقیدت کی وجہ سے بیان نہیں کر سکتا۔“

”کیا مطلب؟“

”وہ بہت پائے کے بزرگوں کے ساتھ تھی.....“

کچھ دیر بعد نئی آنی اس نے گلابی لباس پہنا ہوا تھا اور وہ علی کی حرکتوں کے باعث اور اپنے خوف کے ہاتھوں جان بلب تھی۔ جب وہ کچھ دیر بعد جانے لگی تو شباب بھائی تیزی سے بچ سے اٹھے اور اس کے قریب جا کر بولے..... ”یکسیوزمی کیا آپ میرے لئے دعا کر سکتی ہیں۔“

نئی ششدر رہ گئی اس نے بڑی لجاجت سے کہا..... ”جی ضرور.....“ لیکن میں آپ کے لئے کیا دعا کروں۔ آپ کے پاس تو سب کچھ ہے۔“

”آپ میرے حسن خاتمہ کے لئے ضرور دعا کر دیجئے گا۔“

نئی خاموش چلی گئی..... میں نے حسد کی لہر کو اپنے اندر ابھرتے دیکھا..... مجھے نئی بڑی ہی خوش نصیب نظر آئی جس سے شباب بھائی نے دعا کی استدعا کی تھی۔

شباب بھائی کسی چیز کو Correct نہیں کرتے تھے۔ بڑی گاڑیاں، عورتیں، خوبصورت بچکے..... میں نے کبھی ان کے منہ سے یہ بات نہ سنی کہ کاش یہ مجھے مل جائے۔ چونکہ وہ للچا ہٹ سے کسی چیز کو نہ دیکھتے تھے اس لئے میں نے کبھی انہیں تجویز کرتے بھی نہیں دیکھا اور اسی لئے شاید وہ حسد کا شکار کبھی نہ ہوئے۔ نظریات میں توازن، گفتگو میں نرمی، لباس میں میانہ روی، خوراک میں سادگی، دوستی میں ثابت قدمی، رابطوں میں مہربانی، ناراضگی میں خاموشی اختیار کرتے۔ وہ بچ بولنے لیکن بچ کو دل آزادی کے طور پر استعمال نہ کرتے۔ پیہبان کے ہوئے میں ہوتے تو نہ انہیں پنگھالگ جاتا کہ خرچ کر ہی لیں نہ اس قدر انہماک ہوتا کہ کتنے بچ گئے ہیں۔ اور ان کے بچنے کے ساتھ اب بک بیلنس کس قدر ہو گا؟ انکساری اور تحمل نہ کسی کو مرعوب کرنے کے لئے نہ اپنے آپ کو ہر دلعزیز بنانے کے لئے استعمال میں تھا۔ بس انہیں علم تھا کہ کوئی شخص آپ سے کمتر نہیں..... ایک مرتبہ صبح کے وقت جب وہ ناشتے کے لئے بیٹھے ہوئے تھے میں نے کہا..... ”چلے شباب بھائی مان لیا کہ آج کے زمانے میں جب عقل اور تعلیم اتنی بڑھ گئی ہے ہم بیعت کے تمام کوائف پورے نہیں کر سکتے لیکن بالفرض کوئی شخص پکا ارادہ کر لے تو پھر وہ مرشد کیسے تلاش کرے؟“ شباب بھائی بولے.....

”اول وہ شخص آپ کو خود ہی ملے گا اور آپ کی سچی لگن کی کنڈی میں پھنس کر آپ کے پاس آئے گا۔ بالفرض ایسے نہ ہو۔ تو صبح سویرے گھر دم اٹھتے ہی پھاٹک کھول کر کھڑے ہو جائیں جو پہلا آدمی نظر آئے اسے اپنا مرشد مانیں اور اپنی خواہش کے مقابلے میں اس کی رائے کو صائب جائیں۔“

یہ شباب بھائی کا آخری ہی بیہ اتھا۔

وہ رات کو دودھ میں شداور بادام روغن ملا کر پیاکرتے تھے۔ انیق خاں کی بیوی غزل نے کئی بار ان سے



پوچھا کہ بچا دودھ لادوں۔ میں نے بھی کہا..... ”شباب بھائی چھوٹی کھسی کا شمد آیا ہوا ہے آپ ضرور پئیں۔“ لیکن وہ مائل نہ ہوئے..... ان کی آواز میٹھی ہوئی تھی اور چلنے پھرنے میں تھکان کے آثار تھے۔ ہمارا معمول تھا کہ جب وہ کاسنی کمرے میں موجود ہوتے اتنے دن ہم رات کے کھانے پر کہیں نہ جاتے لیکن اس بار انہوں نے خود کہا۔

”واصف صاحب کی محفل میں ہم سب چلیں گے بہت سے لوگ مل جائیں گے“ لیکن جس محفل میں ہم سب نے شرکت کی وہاں انہوں نے میزبان کے اصرار کے باوجود کچھ نہ کھایا۔ وہ کوئی بھی بچی ہوئی چیز کھانا نہ چاہتے تھے۔

دوسری شام کہنے لگے..... ”اشتیاق کے گھر کھانا ہے اشیر تیار ہا تھا کہ تم دونوں نہیں جا رہے۔“ میں نے کچھ من گھڑت جواب دیا۔

بولے..... ”ہم تینوں چلیں گے اشتیاق سے ملے مجھے ایک عرصہ ہو گیا ہے۔“

”تجھے تو لوگوں سے گھبراہٹ ہوتی ہے قدرت.....“ خان صاحب نے کہا۔

”ہاں ہوتی ہے..... ہوتی تو ہے..... لیکن تمہارا بھائی مجھے اچھا لگتا ہے۔“

برائیس آدمی ہے۔“

اس آخری قیام کے دوران وہ ہمارے ساتھ ہر ذر پر گئے۔ لوگوں کے ساتھ اصرار کے ساتھ ملے۔ باتیں کیں اور پھر اپنے پیٹنٹ جیلے کے ساتھ اسلام آباد چلے گئے۔ کئی سالوں سے وہ جانے سے پہلے ایک ہی جملہ بولا کرتے تھے۔

”اس بار میں اسلام آباد جا کر اپنا Conduct درست کروں گا.....“

ان کے جانے کے بعد ہم دیر تک یہی باتیں کرتے رہے کہ اگر شباب صاحب کو اپنا کردار درست کرنے کی ضرورت ہے تو ہم اس سلسلے میں کیا کریں؟۔ خان صاحب اور اشیر خاں شباب بھائی کو اسلام آباد چھوڑ کر واپس آئے تو دونوں کے چہرے پر اداسی تھی۔ وہ سارا راستہ آپس میں بالکل نہ بولے تھے۔

رات جس سے بوجھل تھی۔ کمرہ میں نمی تیرتی پھرتی تھی۔ ہمارے ہمسائے میں لگے ہوئے بیری کے درخت دم بخود کھڑے تھے۔ اتنی بوا بھی نہ چل رہی تھی کہ اتار کے نازک پتے ہلتے۔ لان میں نیون لائٹ پھیل تھی اور اس کی چوٹی روشنی میں لان کی گھاس نیلی نظر آتی تھی۔ پھر ایک فون کی گھنٹی بجی..... رات گئے ہمارے گھر کئی بار رانگ نمبر بجتے ہیں کبھی کبھار ایسے لوگ بھی فون کرتے ہیں جو اداس، ڈرے ہوئے، معاشرے سے نالاں ہوتے ہیں۔ لیکن اس گھنٹی میں ہلادینے جھنجھوٹ دینے کی قوت تھی۔ خان صاحب جو ہاگ کر کبھی فون تک نہیں پہنچتے ایک ہی جست میں فون کے قریب تھے۔

”ہاں..... ہاں..... بالکل حق ہوا..... ہاں..... میں سن رہا ہوں..... ٹھیک ہے.....“

صبح تڑکے چلوں گا ہاں ہاں..... وہ ساتھ ہوں گے..... کیوں نہیں حق ہوا..... بالکل“

میں نے خان صاحب کا چہرہ دیکھا

”تو شباب بھائی چلے گئے.....؟“

”ہاں.....“

میں نے فوراً ماں بن کر سوچا..... ”خان..... اشیر کو نہ بتائیں پلیز..... وہ اتنی برداشت نہیں رکھتا.....“

”لیکن اسے تو ذرا ایسا کرنا ہو گا.....“ خان صاحب بولے

”وہاں چل کر پتہ لگ جائے گا.....“

”اچھا.....“

ان کے پیچھے پیچھے چلتے ہوئے میں نے پھر ماں کی طرح سوچا..... ”خان..... غزل کو بھی نہ بتائیں اس کا امتحان ہے..... پرچہ خراب ہو جائے گا.....“

”اچھا.....“

ہم دونوں چپ چاپ اندر کمرے میں آکر بیٹھ گئے..... کھڑکی میں سے جامن کا وہ گھٹا درخت نظر آنے لگا جس کے اندر کہیں بتی جل رہی تھی۔ ہم دونوں خالی ذہن تھے۔ دونوں میں بہت نہ تھی کہ وہ ایک دوسرے کو تسلی دیتے۔ نہ جانے ہم کب تک ایسے ہی بیٹھے رہتے..... لیکن یک دم اشیر خاں شہتیر کی مانند کھڑا ہو کر انگریزی میں بولا ”پر وہ تو چلے گئے ہیں..... وہ تو چلے گئے ہیں امی..... میں نے انہیں جاتے دیکھا ہے میں ان کے ساتھ جاؤں گا.....“

میں نے کھڑے اشیر کی جانب دیکھا وہ پوری طرح سوراہا اس کے کندھے تھکتے نہ جانے کس وقت میں بھی سو گئی۔

تڑکے ہم تینوں چپ چاپ اٹھے اور اسلام آباد جانے کی تیاری کرنے لگے۔ میری امی نے بھانپ لیا لیکن وہ خاموش رہیں جیسے اس وقت کچھ بھی بولنا بے معنی تھا۔ ہم گوجرانوالہ تک یہی ظاہر کرتے رہے جیسے شباب بھائی بیمار ہوں اور ہم تینوں انہیں ہسپتال دیکھنے جا رہے ہوں لیکن اشیر خاں نے اس بیماری کے ڈرامے میں کوئی دلچسپی نہ لی۔ گوجرانوالہ کے بعد ہم تینوں خاموش ہو گئے۔ کبھی کبھی وہیل پر اشیر کے ہاتھوں پر اچانک پانی کی بڑی بڑی بوندیں آگرتیں اور وہ کسی کسی ٹرک کو ایسے کراس کرتا جیسے ڈرائیونگ میں نو آموز ہو۔

ایشی خاں امریکہ میں تھا۔

ٹیلہ، انیس کو اطلاع نہ دی جاسکی۔

غزل کو میں نے اس لئے نہ بتایا کہ اس کا پرچہ تھا لیکن وہ دو بجے اکیلی اسلام آباد آگئی اندر باہر بجوم تھا۔ ایسے لوگ جن کی آج تک کسی نے نہ سنی تھی۔ ایسے جن کی سب لوگوں نے سنی تھی اور وہ پھر بھی لفظوں سے، باتوں سے، شکایتوں سے پر تھے۔ وہ لوگ جن کے نزدیک تقدیر بھری، فطرت ظالم اور معیشت انصاف تھی۔ بڑھی مائیاں جن کے ہاتھوں میں سبز چادریں تھیں۔ جوان جو جینز پر پہنے ہوئے تھے۔ نومند عورتیں جو سیاہ چشموں کے پیچھے رو رہی تھیں۔ ایسے سرکاری افسر جو شلوار قمیضوں میں ملبوس اپنی آدھی برس نیل مٹی گھر ہی چھوڑ آئے تھے۔ لان میں، سڑک پر، کمروں میں لوگ ایسے پھر رہے تھے جیسے ٹرین کے حادثے کے شکار مسافر پٹری کے ساتھ ساتھ چکر لگاتے ہیں۔ تمام منجے، لو لے لنگڑے، ڈرے ہوئے، خوفزدہ، بھولے بھٹکے، میز ہیوں پر چڑھتے ڈر رہے تھے کہ اوپر ایک درویش بڑے آئندے ان سب کے ہوتے ہوئے اپنے حسن خاتمہ کو پہنچ گیا تھا۔ فضا گرم تھی اور اس میں نمی پوری سو فیصد تھی۔

سوئم کے روز سب آہستہ آہستہ سیپارے پڑھ رہے تھے میں کھڑکی کے رخ بیٹھی تھی اور سیپارہ دیکھنے، سمجھنے اور پڑھنے کے درمیان کہیں معلق تھی۔ پھر گڈی کہیں سے آگئی اور اپنا محبت بھرا ہاتھ میرے کندھے پر رکھا۔ اس کے وجود سے مجھے وہی محبت کی خوشبو آئی جو شاہوں کا خاصا ہے۔

”چی سیپارہ جلد ختم کر لیں۔ دعا ہونے والی ہے۔“

میں نے سیپارے سے نگاہ اٹھا کر اندر کی طرف دیکھا۔ ثاقب ایک بھٹی سی عورت کو پانی کا گلاس دے کر غسل خانے کے ساتھ کندھا جوڑے کھڑا تھا۔ اس کے چہرے پر صرف آنکھیں خشک آنسوؤں سے چمک رہی تھیں۔ اوپر جانے والی میز ہیوں پر یوگی اشفاق کھڑے زانوؤں پر ہاتھ دھرے کچھ تیبہ کرنے کچھ چھوڑ دینے کے انداز میں بیٹھے تھے۔ قالین پر نیلی جینز میں ملبوس پتنگ کی طرح کھنچا چہرہ لئے اشیر خاں اتنا چپ تھا جتنے بادل برسنے سے پہلے ہوتے ہیں۔ عکسی مفتی بہادر ہونے کی کوشش میں چل پھر رہا تھا۔ پراس کی جعلی بہادری کا نپتے ہاتھوں سے ظاہر تھی۔ اندر باہر۔ چہرے ہی چہرے تھے۔

ان خالی چروں سے گھبرا کر میں نے کھڑکی کی طرف دیکھا۔ وہاں چاند کا ہاتھ چھڑا کر اکیلا ستارہ جما کھڑا تھا۔

شباب بھائی کے گزر جانے کے عین تیسرے دن مجھے ایک سوال کا جواب مل گیا جو پچاس سال پہلے میں نے اپنی ماں سے پوچھا تھا ”ای گزر گیا کیا ہوتا ہے۔ لڑکیاں کتنی ہیں میرا باپ گزر گیا ہے۔“

میری ماں بہت بھولی ہے وہ بڑے سے بڑا صدمہ سمجھ کر بھی تاش کھیل سکتی ہے۔

سکر بیبل کے الفاظ سوچ سکتی ہے۔ کرکٹ کنٹری سن سکتی ہے تالیاں بجاتی اپنے نواسوں کو آوازیں دیتی برآمدے میں گھوم پھر سکتی ہے۔ لیکن میرے اندر جب کوئی سوال جنم لے کر صدمے کی شکل اختیار کرتا ہے تو پھر مجھے آزاد نہیں کرتا۔ سوال خود بھی گرواب بنارہتا ہے اور مجھے بھی چکر پھیریاں دینے جلد رہا ہے۔

اس شام اشیر خاں، یوگی اشفاق، ثاقب، مفتی جی، عکسی۔ ان گنت چروں میں میرا سوال ابھر رہا تھا۔ میں نے کھڑکی والے ستارے کی طرف منت سے دیکھا۔

جب کوئی رعایت کرنے، بات سمجھنے، پناہ دینے والا باہر کت باپ اپنے خوفزدہ یتیم بچوں کو زندگی سے دست پنچہ ہونے کی تعلیم دینے بغیر گزر جاتا ہے تو پھر ایسے خوفزدہ یتیم بچے ساری عمر آسمان کو نکتے رہتے ہیں۔ دن کے وقت وہ دھوپ درپچوں میں ایک جانے جانے چہرے کی تلاش کرتے رہتے ہیں۔ شام کو پہلے ستارے کی آمد پر ان کا احساس جلا وطنی کبھی کبھی اتنا شدید ہو جاتا ہے کہ وہ میری طرح گھبرا کر کہنے لگتے ہیں۔ ”امی میں وہاں سے آئی ہوں اس چمکدار ستارے میں میرا گھر ہے۔“